کراچی

آنکھ مچولی

ستمبر

پاکستان کا ماہِ دفاع

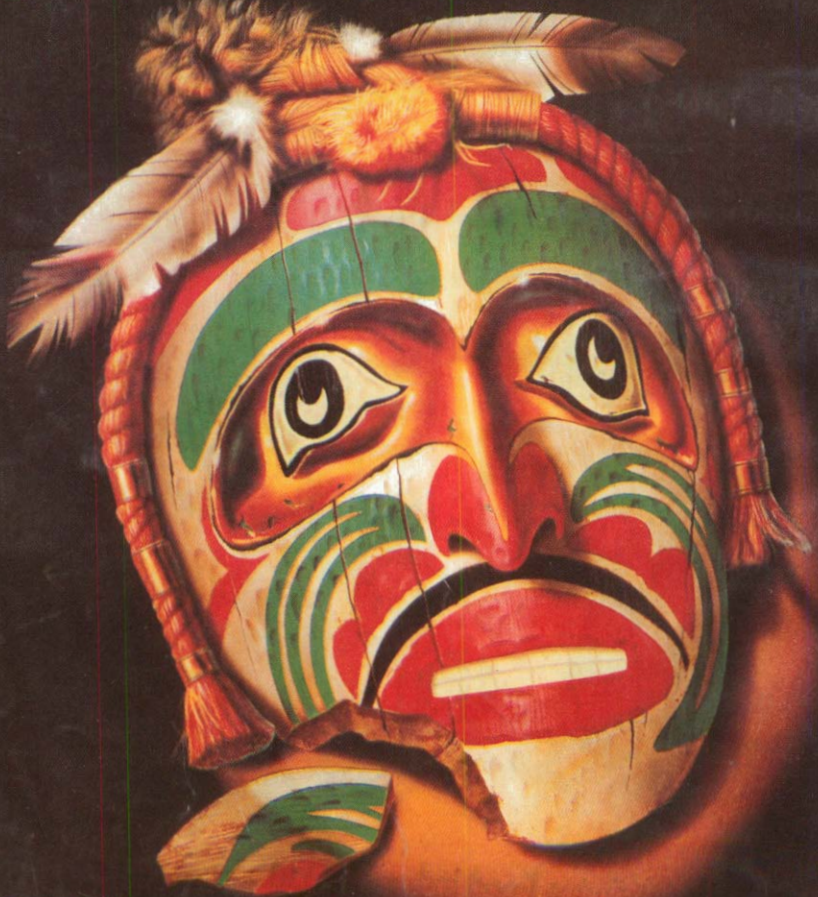

IMPORTED

QUICE
QUICE Lemon Lime
2 GREAT CANS

2 EXCITINGWAYS TO COOL DOWN & FRESHEN UP !

Quice Food Industries Ltd.
ddin Afghani Road, Near Bahadurabad

UHU® یوہو کڈز کلب

دنیا کی سب سے اچھی GLUE بنانے والی مشہور زمانہ جرمن کمپنی UHU® (یوہو) نے قارئین آنکھ مچولی کے لئے پُرکشش CASH انعامات کا اعلان کیا ہے۔ درجِ ذیل سوالات کے درست جوابات ارسال کریں اور CASH انعامات حاصل کریں۔

پہلا انعام	2 ہزار روپے نقد
دوسرا انعام	1 ہزار روپے نقد
تیسرا انعام	500 روپے نقد

ہر درست حل پر ایک UHU® کی T. SHIRT

مقابلہ نمبر 3

1 رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کونسا رنگ زیادہ پسند تھا؟

2 جوتا پہنا کیوں نہیں؟ سموسہ کھایا کیوں نہیں؟ ان دونوں پہیلیوں کا جواب ایک ہی ہے ذرا جلدی سے بتائیے؟

3 ع خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
اس شعر کا پہلا مصرعہ تحریر کریں

4 پانی کن دو گیسوں سے مل کر بنتا ہے؟

5 کس اسلامی ملک نے حالیہ اولمپکس کے فٹبال کے مقابلوں میں دنیا کی مضبوط ترین یورپین ٹیموں کو شکست دیکر گولڈ میڈل حاصل کیا؟

شرائط

1: جوابات کے ساتھ ایک عدد UHU® stic پر لپٹا ہوا پلاسٹک ریپر ضرور بھیجیں۔ 2: ایک سے زائد حل کی صورت میں ہر حل کے ساتھ UHU® ریپر بھیجنا لازمی ہے۔ 3: انعامات کا فیصلہ ایک سے زائد درست جوابات کی صورت میں قرعہ اندازی کے ذریعہ کیا جائے گا۔ 4: انعامات کا اعلان حتمی اور ناقابل چیلنج ہوگا۔ 5: تمام حل 10 اکتوبر تک لازمی آنکھ مچولی کے پتے پر ارسال کریں۔ 6: خوش نصیب انعام یافتگان کا اعلان نومبر کے شمارے میں کیا جائے گا۔

Don't Say GLUE — Say UHU®

نوٹ: یوہو مقابلہ نمبر 1 کے نتائج صفحہ نمبر 17 پر ملاحظہ کیجئے

Goldfish
Deluxe Pencil

حقیر سی لکیر

حقیر سی لکیر سے اعلیٰ تحریر تک
ہر قدم، ہر مرحلے پر آپ کی ساتھی

گولڈ فِش ڈیلیکس پینسل

SHAHSONS (PVT) LIMITED
D-88 S.I.T.E MANGHOPIR ROAD, KARACHI-16.
PHONE: 2577392 - 95 (4 Lines)

جہاں چلے، رواں چلے

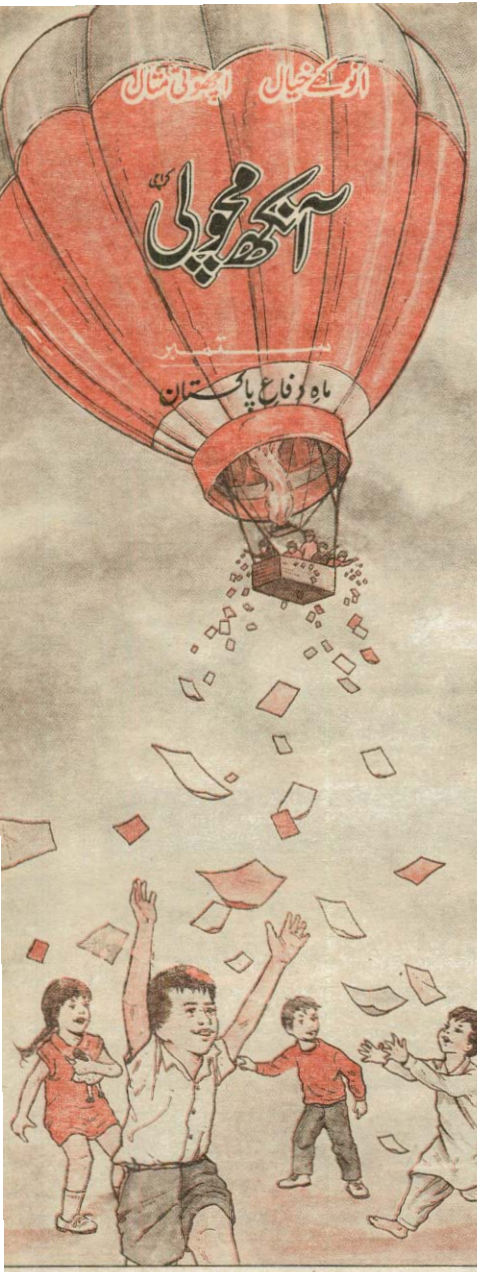

نگرانِ اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

نگرانِ امورِ انتظامیہ
تجمّل حسین چشتی
طارق فوزی

مجلسِ تحقیق و تصنیف
محمد سلیم مغل
محمد جاوید خالد

مشاورت
ڈاکٹر طاہر مسعود

امورِ تجارت
شاہ محمد

امورِ تشہیر
عمران احمد

خطاطی
محمد سلیم اختر

پیسٹنگ
دانش اختر

واضح رہے

۱

اِس کتاب میں شائع ہونے والی جملہ تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ (گرین گائیڈ اکیڈمی) محفوظ ہیں۔ بغیر اجازت کوئی بھی تحریر یا تصویر شائع نہیں کی جاسکتی۔

۲

اِس کتاب میں شائع ہونے والی اسلامی اور تاریخی تحریروں (بشمول قرآن و حدیث)، کے سوا جملہ کہانیوں کے کردار فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمّہ دار نہ ہوگا۔

۳

اِس کتاب کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچّوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں کی نشوونما اور کردار سازی کے لیے شائع کیا۔

۴

آنکھ مچولی کا یہ کتابی سلسلہ وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہتا ہے۔

قیمت: ۱۸ روپے
۷ درہم، ۷ ریال

ناشر: ظفر محمود شیخ طابع: زاہد علی مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ کراچی
خط و کتابت کا پتہ: آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، اے پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

حیرت ناک نمبر
خوفناک نمبر
کہانی اسپیشل نمبر
قہقہہ نمبر
عالمی ادب نمبر
کشمیر نمبر
اطفال نمبر
ایجادات نمبر
دل دل پاکستان نمبر
حقوقِ اطفال نمبر
شرارت نمبر
محنت کش بچے نمبر
فروغِ تعلیم نمبر

اب
اور.... کئی خصوصی نمبروں کے بعد۔

مقابلوں اور انعامات کے انبار لیے

آنکھ مچولی کا

مقابلہ نمبر

جنوری ۱۹۹۷ء
میں شائع ہو رہا ہے

ہم آپ کو دعوتِ تحریر دیتے ہیں

○ مقابلہ کیا ؟ ○ مقابلہ کیوں ؟ ○ مقابلہ کیسے ؟ ○ مقابلے کی تاریخ ؟ ○ مقابلوں کی اقسام ؟ ○ مقابلوں کی نفسیات ○ مقابلوں کے مقابلے ○ تاریخی مقابلے ○ مزاحیہ مقابلے ○ انوکھے مقابلے ○ عجیب و غریب مقابلے ○ ذہانت کے مقابلے ○ علم کے مقابلے ○ کھیلوں کے مقابلے ○ مقابلوں کے کھیل ○ مقابلے کے امتحان ○ امتحان کے مقابلے ○ مقابلوں کی کہانیاں ○ مقابلوں کی نظمیں ؛

آپ کو زندگی کے بڑے مقابلوں میں تیار کرنے کے لیے آنکھ مچولی بہت جلد آرہا ہے

مقابلے کے موضوع پر دلچسپ تحریروں سے سج دھج کر !

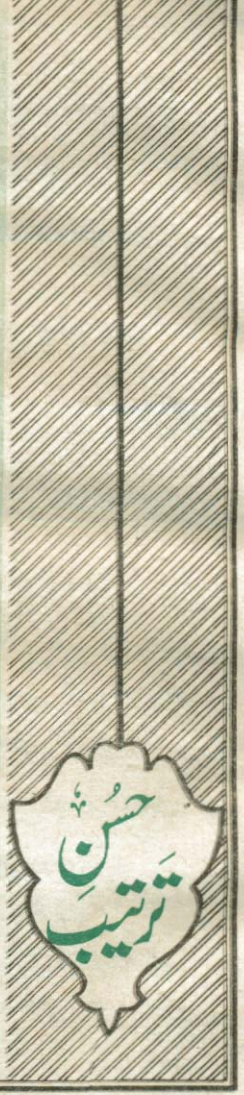

حسنِ ترتیب

حمد باری تعالیٰ	افضال عاجز	۱۰
تفریحاتِ اسلامی	شہناز بانو	۱۱
تمھیں ہمارا اسلام پہنچے	انتخاب	۱۴
میرے وطن کا دشمن (نظم)	محمد جاوید خالد	۱۸
میٹھے جوتے	عصمت چغتائی	۲۰
پہلی بار	محمّد صابر	۲۵
ہمیں معاف کر دینا	احسان الحق حقانی	۲۸
ٹوٹی کہاں کمند	محمد عادل منہاج	۳۱
کچھوا اور خرگوش	ابنِ انشاء	۳۵
مقدّس موت	ترجمہ: ستار طاہر	۳۷
قصہ کوثر	سلیم مُغل	۴۹
بابائے ملّت (نظم)	مجید لاہوری	۵۱
قائد کا بچپن	خواجہ رضی حیدر	۵۲
تاشقند	ابو غازی محمّد	۵۶
مری سرزمین پہ کبھی اَب نہ آنا (نظم)	محمد علی انصاری	۶۲
شکار کا بخار	شازیہ بخاری	۶۵
اولمپک کے نئے معرکے	یحییٰ حسینی	۷۴
شور	عدیل اسلم	۷۹
بی آر بی کی کہانی	شیخ عبدالحمید عابد	۸۵
لطیفے شطیفے	سمن عارف	۸۸
وعدے کا پکّا	الطاف حسین	۹۱
بازی گر (نظم)	فضل حق	۹۶
پاکستان بمقابلہ انگلینڈ	سیّد یحییٰ حسینی	۹۷
میں کیوں رو رہا تھا	حمدون ادیب	۱۰۱
اونٹ	سیّد مسعود الحسن رضوی ادیب	۱۰۵
محبت کا راز	محمّد طیب	۱۰۷
بنام آنکھ مچولی	قارئین کے خطوط	۱۱۳
آنکھیں	عبدالحمید عابد	۱۱۸
چٹورا چور	محمد عمر قریشی	۱۲۳
بکری کے بچّے (نظم)	بالاچ بلوچ	۱۲۷
اقرار	خالد بن محمود احمد	۱۳۰

شراب کا دور چل رہا تھا اور زاذان نامی ایک مغنّی بربط پر گا رہا تھا۔ عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ
عنہ کا گزر ادھر سے ہوا۔ مغنّی کی آواز سن کر فرمایا "کیا ہی اچھی آواز ہے۔ کاش اس آواز
قرآن پڑھا جاتا۔"
عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو چلے گئے، مگر زاذان نے ان کی آواز سن لی تھی۔
نے لوگوں سے پوچھا :
کون شخص تھا؟"
اللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔" لوگوں نے جواب دیا۔ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
جلیل القدر ساتھی۔"
فرما رہے تھے؟" زاذان نے دریافت کیا۔
تے تھے کتنی اچھی آواز ہے، کاش اس آواز سے قرآن پڑھا جاتا۔"
یہ سنتے ہی زاذان کی حالت غیر ہو گئی۔ دل میں ایک ہوک اٹھی اور آنکھوں میں آنسو بھر
۔ اٹھا، بربط کو زمین پر مار کر توڑ ڈالا اور دوڑتا ہوا عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے
پہنچا۔ پگڑی گردن میں ڈال لی اور ان کے قدموں میں گر کر رونے لگا۔ عبداللہ ابن مسعود
اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے اٹھا کر اپنے گلے سے لگالیا اور خود بھی رونے لگے۔ پھر بولے،
"جس شخص سے خدا محبت کرتا ہے، میں اس کو اپنا دوست کیوں نہ بناؤں۔"
اب زاذان حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں رہنے لگے۔ قرآن
سیکھا اور دوسرے علوم پڑھے اور ایسا کمال حاصل کیا کہ آج ان کا شمار تابعین کی صفِ اول
وتا ہے۔

پہلی بات

سترہ دن ..... وہ سنہرے سترہ دن ہماری تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔ ان سترہ دنوں میں سارے ملک میں چوری، ڈاکہ، قتل، اسمگلنگ، چور بازاری کا کوئی واقعہ ریکارڈ نہیں ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ سارے مجرموں نے جرم سے توبہ کرلی ہے۔ سب کے دل نفرتوں اور کدورتوں سے خالی ہوگئے ہیں۔۔۔۔ سب کو اپنے ملک سے عشق ہوگیا ہے اور ایسا عشق کہ ہر ایک اس پر جان نچھاور کردینا چاہتا ہے۔ کہیں ملکی دفاع کے لئے فنڈ اکھٹا کیا جارہا ہے تو کہیں زخمیوں کو خون دینے کے لئے لمبی لمبی قطاریں لگ رہی ہیں، ہر ایک چہرے پر جوش و خروش ہے، ہر ایک دل میں شہادت کی تمنا ہے۔

پھر ایسا وقت لوٹ کر نہیں آیا۔

یہ وہ دن تھے جب ہمارے پڑوسی ملک نے اپنی طاقت کے زعم میں رات کی تاریکیوں میں ہماری سرحدوں پر حملہ کردیا تھا۔۔۔ اور تب اپنے سے پانچ گنا بڑی طاقت کو شکست دینے کے لئے ساری قوم متحد ہوگئی تھی۔۔۔۔ سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئی تھی۔

ایسا ہی ایک نازک وقت اس قوم پر صرف چھ سال بعد پھر پیش آیا۔ لیکن تب نہ چوری بند ہوئی، نہ ڈاکہ۔۔۔ جرائم معمول کے مطابق ہوتے رہے اور قوم ٹکڑوں میں بٹی رہی۔

نتیجہ صاف ظاہر تھا، ملک ٹوٹ گیا۔۔۔ ہم شکست کھاگئے۔ تاریخ کی سب سے بڑی شکست

"یوم دفاع" کے حوالے سے ہمیں ان دونوں واقعات کو یاد رکھنا ہے۔۔۔۔ ایک واقعے سے عزم و ولولہ، جوش و جذبہ، اتحاد و یکجہتی کا سبق لینا ہے۔۔۔ اور دوسرے واقعے سے یہ سبق سیکھنا ہے کہ جب مسلم قوم اللہ کو بھول جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے لڑا دیتے ہیں اور آپس کی لڑائی سے فائدہ اٹھا کر دشمن غالب آجاتا ہے۔۔۔ یہ اللہ کا انتقام ہے۔۔۔۔ ہمیں اللہ کے انتقام سے ڈرنا چاہئے۔

جب ہم اللہ سے ڈرنا سیکھ لیں گے تو پھر ہمیں بڑے سے بڑے دشمن سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

حمد باری تعالیٰ

افضال عاجز

یہاں تیری کیسے ہو حمد و ثنا نہیں تجھ سے برتر کوئی دوسرا
زمیں آسمانوں کا خالق ہے تو کہ دونوں جہانوں کا رازق ہے تو
ترے دم سے ہے گلستاں میں بہار تری ہی بدولت گلوں میں نکھار
یہ چمکیلا سورج، یہ تارے، یہ چاند ہو تیرا اشارا تو پڑجائیں ماند
چرند و پرند اور انساں تمام یہ لے لے کے جپتے ہیں سب تیرا نام

میں عاجزؔ گناہ گار بندہ ترا
خدایا مری بخش دے ہر خطا

کھیل مقابلے اور تفریحات
عہدِ نبوی میں

شہناز بانو

پیارے نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاقیات کے ساتھ ساتھ جسمانی صحت کی اہمیت پر بے حد زور دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا : "انسان کو صحت مندانہ تفریح کرنی چاہئے۔" آپؐ نے مردوں کے لئے ورزش، پہلوانی، تیراکی، تیراندازی اور گھڑ سواری کا حکم دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا :

"مسلمان کو نہ صرف اندرونی بلکہ بظاہر بھی توانا نظر آنا چاہئے اس لئے کہ کافر پر مسلمان کی ظاہری شخصیت کا رعب بھی ہونا چاہئے۔"

طاقت اور توانائی حاصل کرنے کے لئے آپؐ نے روغنِ زیتون استعمال کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا : "زیتون کو کھاؤ یا جسم پر ملو یہ ہر طرح تمہارے لئے فائدہ مند ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو نشانہ بازی اور تیراندازی کا شوق دلایا۔ آپؐ خود صحابہ کرامؓ کے درمیان ان کے مقابلے کرایا کرتے تھے

اور اس کی مشق کے لئے آپؐ صحابہؓ کو دو حصّوں میں بانٹ دیا کرتے تھے۔

ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا!

"تیر چلاؤ!!" اور ایک پارٹی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "میں اس پارٹی کی طرف ہوں گا۔"

یہ سُن کر دوسری پارٹی کے لوگوں نے تیر چلانے سے اپنے ہاتھوں کو روک لیا۔ جب آپؐ نے اس کا سبب پوچھا تو انہوں نے جواب دیا۔

"جب اس پارٹی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شامل ہیں تو ہم اس کے مقابلے میں کس طرح تیر چلا سکتے ہیں؟"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ فرمایا۔

"تیر چلاؤ! میں تو تم سب کے ساتھ ہوں۔"

مسلمانوں کی جسمانی تربیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑوں کی دوڑ بھی کروائی۔

تیراندازی کی طرح تفریحاً" گھڑ دوڑ کے مقابلے کرائے جاتے اور بہترین شہ سوار کو آپؐ خوب شاباشی دیتے۔

گھوڑوں کی دوڑ کے مقابلے میں لمبی دوڑ پانچ اور چھ میل کی ہوا کرتی تھی اور ہلکی دوڑ ایک میل کی بھی ہوتی تھی۔

تیرنے کا مشغلہ بھی اپنایا، صحابہ کرامؓ کے ساتھ کبھی کبھار تالاب میں تیرا کرتے تھے اور اس کے لئے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو دو ساتھیوں کے جوڑے بناتے اور پھر ہر جوڑے کے ساتھی دُور سے تیر کر ایک دوسرے کی طرف آتے تھے۔ اسی طرح کے ایک موقع پر آپ نے اپنا ساتھی حضرت ابو بکر صدیقؓ کو بنایا۔

وقفے کے بعد بارش ہوتی تو تہہ بند باندھ کر پھوار میں نہانا پسند فرمایا۔ کبھی تفریحاً" کسی کنوئیں میں پاؤں لٹکا کر اس کے دھانے پر بیٹھ بھی جایا کرتے تھے۔ مسرّت کے موقعوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوٹی بچّیوں کا دف بجا گانا پسند فرمایا۔

ایک مرتبہ عید کا موقع تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس دو بچّیاں گیت گا رہی تھیں۔ پاس ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم لیٹے تھے۔ اچانک حضرت ابو بکرؓ آ گئے نہایت غصّے سے ڈانٹا کہ اللہ کے رسولؐ کے گھر میں یہ کیسا شیطانی ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "انہیں گانے دو۔"

عام طور پر لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح اور چھوٹی موٹی تفریحات کا حال سُن کر تعجب ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک تو مذہب کے ساتھ سنجیدگی کا تصور ہمیشہ موجود رہا اور دوسرے دین دار اور متقی لوگوں کی سنجیدہ صورتیں اور خُشک طبیعت لوگوں کے سامنے موجود رہیں۔ لیکن

حضورؐ نے اللہ کے حقوق کے ساتھ ساتھ بندوں کے ——— حقوق بھی ——— متعین فرمادیئے۔ چنانچہ جب ابن عمرؓ سے پوچھا گیا "کیا رسول اللہ کے رفقا بھی ہنسا کرتے تھے؟" تو انہوں نے فرمایا :

"ہاں ہنستے تھے' اور ان کے دلوں میں پہاڑ سے زیادہ ایمان تھا۔"

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تفریحات کو پسند فرمایا اور ان کے لئے جائز حدوں میں راستے نکالے۔ یہی وجہ ہے کہ دینِ اسلام کو دینِ فطرت کہا گیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا!

"عظیم کارنامے انجام دینے والی شخصیت کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ فرائض حیات کے بوجھ کو اپنے تبسم سے گوارا بنادے اور اپنے ساتھیوں کے دل میں گھر کرے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقا سے ایسے بے تکلفانہ انداز سے پیش آتے تھے کہ آپ کے رفقا کے دلوں میں آپ کی محبت رچ بس گئی تھی۔

آپ ہنسی دل لگی کی باتیں کرتے اور مجلس میں شگفتگی کی فضا پیدا کردیتے تھے۔ مگر توازن و اعتدال ہمیشہ ملحوظ رہتا۔ مزاح کا رنگ آٹے میں نمک کی طرح رہتا تھا اور اس میں بھی خلافِ حق کبھی بھی کوئی بات شامل نہ ہوتی تھی اور نہ کبھی کسی کی دل آزاری کی جاتی اور نہ ہی ٹھٹھے لگا کر ہنسنا معمول تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مُسکراہٹ میں غُنچوں کے کھلنے کا گمان ہوتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دانت مُسکراہٹ کے دوران نمایاں ہوتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی زور سے قہقہہ لگا کر نہیں ہنسے اور آپؐ نے اس طرح ہنسنے سے منع کیا اور فرمایا : "زیادہ مت ہنسا کرو۔ زیادہ ہنسا دلوں کو مُردہ کردیتا ہے۔"

آپؐ نے یہ بھی فرمایا :

"تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے اس حق کو پورا کرو اور بیماروں جیسی شکلیں نہ بناؤ۔"

ہر مُسلمان کے لئے لازم ہے کہ وہ صحت مند تفریحات کے لئے وقت نکالے' خود بھی خوش رہے اور دوسروں کو بھی خوش و خُرم رکھے۔ ایک صحت مند اور پاکیزہ معاشرے کا قیام پیارے نبی کریمؐ کے اسوہ حسنہ پر چل کر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔!!

- اگر کوئی قابل آدمی دوستی کے لائق نہ ملے تو کسی نااہل سے دوستی مت کرو (حضرت علیؓ)
- دل کو زندہ اور بیدار رکھنے کے لئے اچھی کتابوں کا پڑھنا ضروری ہے۔ (امام غزالیؒ)

تمہیں ہمارا اسلام پہنچے

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ پورے زور و شور سے جاری تھی کہ گلاب دیوی ہسپتال میں ایک سپاہی شدید زخمی حالت میں داخل کیا گیا۔ وہ مسلسل دو روز سے بے ہوش تھا۔ اس کے سر میں گولی لگی تھی۔ جس کو آپریشن کے ذریعے نکالا گیا تھا۔ تیسرے روز اس کو ہوش آیا۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے پوچھا۔

"میں کہاں ہوں؟"

"تم دوستوں میں ہو۔" جواب ملا۔

"دوستوں میں؟" وہ حیران سا ہو گیا۔ "مگر یہ کون سی جگہ ہے۔ آپ لوگ کون ہیں؟ میری جیپ کہاں ہے؟ کرنل صاحب کدھر ہیں اور مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

"میرے عزیز! تم محاذ پر زخمی ہو گئے تھے۔ اس وقت تم گلاب دیوی ہسپتال میں ہو اور انشاء اللہ جلد صحت یاب ہو جاؤ گے۔"

وہ زخمی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "مجھے ہسپتال کیوں لایا گیا ہے۔؟ میری گن کہاں ہے؟ مجھے واپس محاذ پر بھیج دو۔ میں نے دشمن کے تیرہ آدمی ہلاک کئے تھے۔ ابھی بہت باقی ہیں ڈاکٹر کو بلوا دیں' مجھے چھٹی دلوادیں۔ دیکھو ناں اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔" زور زور سے بولنے اور اٹھ کر بیٹھ جانے سے اس کے زخم کے ٹانکے کھل گئے اور وہ دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔

یہ صرف ایک واقعہ نہیں۔ اس ہسپتال میں بہت سے زخمی مجاہدین تھے۔ ہر مجاہد الگ الگ داستان حریت کا ہیرو تھا۔ وہ سب زخمی تھے۔ بعض زخموں پر پٹی بندھی ہونے کی وجہ سے ہل بھی نہ سکتے تھے لیکن ان زخمیوں کے چہروں پر ذرہ بھر بھی تکلیف کی پرچھائیاں نظر نہ آتی تھیں۔ رات کے وقت وہ ترانے گنگنا کر خود کو محاذ پر محسوس کرتے تھے۔ کچھ فوجی بڑے مؤثر لہجے میں علامہ اقبال کی مشہور نظم پڑھ رہے تھے۔

ع ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان

نظم ختم ہوئی تو پورا وارڈ تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھا۔ زخمی فوجیوں کے چہرے ہر وقت مسکراتے رہتے تھے۔ وہ ریڈیو کے ترانوں کے ساتھ خود بھی گاتے۔ جنگ کی خبریں ان کے لئے دلچسپ ترین خبریں تھیں۔ وہاں ٹینکوں میں لڑنے والے آتش زدہ لوگ بھی تھے۔ ایک ٹانگ سے محروم حوالدار حسین شاہ بھی تھا جو پہیوں والی کرسی پر پورے وارڈز میں چکر لگاتا۔ وہ جہاں بھی جاتا وہاں قہقہے بکھر جاتے' چہرے کھل جاتے۔ وہ اکثر کہتا کہ "میری ٹانگ کٹ گئی تو کیا ہوا۔ میں نے دشمن کے ۴۹ سپاہی مارے ہیں۔ پچاسواں لیفٹیننٹ کھنہ تھا' جسے میں زندہ ایک ٹانگ کے سہارے گرفتار کر کے گھسیٹتا ہوا لایا تھا۔ میری ٹانگ پر گولہ نہ لگتا تو میں پچاس سے بھی کہیں زیادہ دشمنوں کو ٹھکانے لگاتا۔ اب تم ہی بتاؤ ایک ٹانگ کے بدلے' انچاس جانیں کوئی مہنگا سودا تو نہیں۔"

چار برقع پوش خواتین بڑی دیر سے ہسپتال میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ پہرے دار نے انہیں بتایا کہ فوجیوں سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔ ایک عورت نے بڑی حسرت سے انگوروں کی ایک ٹوکری پہرے دار کے حوالے کرتے ہوئے کہا:

"یہ فوجیوں کو دے دیں۔ وہ سب ہمارے عظیم بھائی ہیں۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ہم چار بہنیں ہیں ملازمت کرتی ہیں۔ ہمارے ماں باپ نہیں ہیں۔ جب جنگ چھڑی تو ہمارے ... بھاگ کر جانے کے لئے کوئی دوسری جگہ نہ

تھی۔ تب ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ خدانخواستہ اگر مشکل وقت آیا تو ہم زہر کھا کر اپنی عزت بچائیں گی، مگر پھر اللہ تعالیٰ نے یہ فرشتے بھیج دیئے۔ آج ہمیں محسوس ہورہا ہے کہ ہم اکیلی نہیں ہیں۔ ہمارے بہت سے بھائی ہیں جو ہماری عزت اور آبرو کے لئے اپنی جانوں پر کھیل رہے ہیں۔ ہمارے بھائیوں کو ہماری طرف سے، قوم کی ہزاروں بہنوں کی طرف سے سلام کہہ دیجئے گا۔ ہم ہر وقت ان کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگتی رہیں گی۔"

ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ جسے کمیشن ملے ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے، اس کے ٹینک میں پٹرول ختم ہورہا تھا۔ اسے ہدایت ملی کہ واپس آجاؤ۔ اور پٹرول لے کر حملہ کرو۔ مگر وہ مجاہد واپس آنے کے بجائے آگے بڑھ گیا۔ حتیٰ کہ پٹرول ختم ہونے کی وجہ سے ٹینک رک گیا۔ یہ مجاہد واپسی کے نام سے واقف ہی نہ تھا۔ وہ اس وقت تک اندر بیٹھا رہا جب تک دشمن کا ایک ٹینک اس کے قریب نہ آگیا۔ جوں ہی دشمن کا ٹینک قریب آیا۔ وہ شیر دل مجاہد اپنے ٹینک سے نکلا، دشمن کے ٹینک کے پچھلے حصے کے اوپر چڑھا، اپنی گن سے فائر کرنے کے بجائے اندر کے دشمن کو ختم کیا، دشمن کے ٹینک سے پٹرول نکالا اور اپنے ٹینک میں بھر کر بھرپور حملے کے لئے روانہ ہوگیا۔

ایسی تربیت جنگ کی کسی کتاب میں نہیں ملتی۔ کسی تربیت اور ٹریننگ میں ایسی ہدایات نہیں دی گئیں۔ اور یہ ایک واقعہ ہی نہیں، ایسے لاتعداد واقعات اور کارنامے سننے میں آئے جو ان بہادر غازیوں اور شہیدوں نے سر انجام دیئے۔

ایک نوجوان جس کی ہتھیلی پر خون کی طرح ایک سرخ نشان تھا، وہ نشان دراصل اس کی شادی کے لئے لگائی جانے والی مہندی کا تھا۔ جس روز جنگ چھڑی، اس کے دو روز بعد اس کی شادی تھی اور ماؤں اور بہنوں نے بڑے چاؤ سے مہندی لگائی تھی، لیکن اگلے روز بلاوا آگیا اسے شادی چھوڑ کر محاذ پر جانا پڑ گیا، یہ احساسات لئے ہوئے کہ بے شمار بہنوں اور ماؤں کی حفاظت کی ذمہ داری ہے۔

اس جنگ کو کئی سال گزر چکے ہیں مگر ایک انگریز رپورٹر کے الفاظ آج بھی تاریخ کی زینت ہیں جو اس نے اپنے اخبار کو ٹیلی گرام میں بھیجے اس نے لکھا: "سائنسی ترقی میں شاید پاکستان یورپ سے ایک سو سال پیچھے ہے، مگر جذبے، تنظیم اور اتحاد کے معاملے میں پاکستان یورپ سے یقیناً ایک ہزار سال آگے ہے۔ لندن میں

دوسری جنگ عظیم میں مکمل بلیک آؤٹ گیارہویں رات کو ہوا تھا' مگر لاہور کے تربیت یافتہ باشندوں نے پہلی رات کو ہی مکمل بلیک آؤٹ کا مظاہرہ کر کے دکھایا کہ بے شک یہ قوم حیرت ناک کارناموں کی مالک ہے۔ تین میل دور توپوں کی شدید جنگ ہو رہی تھی مگر لاہور کی سڑکیں بالکل آباد تھیں۔ جب بھارت کے بزدلانہ حملے کی خبر آئی تو نوجوان لاہور کے شالیمار باغ میں ہتھیار اٹھائے جمع ہو گئے۔ یہاں عوام' فوج کے لئے اور فوج عوام کے لئے قربان ہو رہی ہے۔ اس قوم کو روئے زمین کی کوئی طاقت نہیں جھکا سکتی۔" انشاء اللہ

UHU انعامی مقابلہ نمبر ۱ کے نتائج

انعامی رقم حاصل کرنے والے خوش نصیب انعام یافتگان

پہلا انعام ۲۰۰۰ روپے نقد۔ منظر الیاس' کراچی

دوسرا انعام ۱۰۰۰ روپے نقد۔ ریاض احمد' کوٹری' سندھ

تیسرا انعام ۵۰۰ روپے نقد۔ عاصمہ تاج۔ لاہور

تمام درست جوابات پر ایک ٹی شرٹ پانے والے انعام یافتگان :

راجہ محمد عاصم کوٹری۔ محمد عمیر خان عثمان جہلم۔ نگہت الیاس' کراچی۔ بلال مسعود' کراچی۔ جہاں زیب' ٹیکسلا۔ محمد ساجد علی' حافظ آباد۔ جواد محب' گوجرانوالہ۔ سدرہ اقبال' کراچی۔ محمد اشرف' لاہور۔ صائمہ کلیم' کراچی۔ عدنان احمد کراچی۔ عزیز الرحمٰن قاری شیخوپورہ۔ صائمہ مسعود بھٹی' سیالکوٹ۔ صباحت حبیب خان کراچی۔ سعدیہ صدیقی کراچی۔ نازش خان' کراچی۔ پروفیسر محمد اکرام' لاہور۔ ریحان احمد' کراچی۔ واجد علی ٹیکسلا۔ محمد نواز خان' کراچی۔ سلطان شمس الحق قذافی' بورے والا۔ نازش رشید قریشی' کراچی۔ بلال مسعود' کراچی۔ محمد ابراہیم خان' کراچی۔ عالیہ ارشاد کراچی۔ یقین شیخ' مظفر گڑھ۔ محمد عمیر قاسم' ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ اسد علی عابد صدیقی' پشاور۔ محمد عدیل دانش' کراچی۔ سعدیہ ارم' کراچی۔ سید بشارت حسین بخاری' رحیم یار خان۔ روبینہ اشرف لاہور۔ محمد عدیل' کراچی۔ ظفر اقبال' کراچی۔

☆ پہلے تین انعامات بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دیئے جائیں گے۔

☆ کراچی کے ٹی شرٹ کے انعام یافتگان اپنے انعامات دفتر آنکھ مچولی سے حاصل کر لیں جب کہ بیرون کراچی کو بذریعہ کوریئر سروس روانہ کر دیئے جائیں گے۔

آنکھوں میں اس کے چربی چہرے پہ اس کے شر بھی
جی چاہتا ہے کہہ دوں جا کے کہیں تو مر بھی

موٹی ہے اس کی گردن
میرے وطن کا دشمن

میرے وطن کو لُوٹا لیکن سزا سے چھُوٹا
کہتا ہے خود کو سچا مکار ہے یہ، جھُوٹا

اس کا 'فریب ہے' فن
میرے وطن کا دشمن

دل کا بہت ہے کھوٹا کم بخت، جعلی، موٹا
لالچ میں گھومتا ہے جیسے کہ کوئی لوٹا

یا بے تلے کا برتن
میرے وطن کا دشمن

چہرے کو نوچ لوں گا جو ہوگا سوچ لوں گا
میں آج ناتواں ہوں تو کل دبوچ لوں گا

اس سے ہے میری ان بن
میرے وطن کا دشمن

محمد جاوید خالد

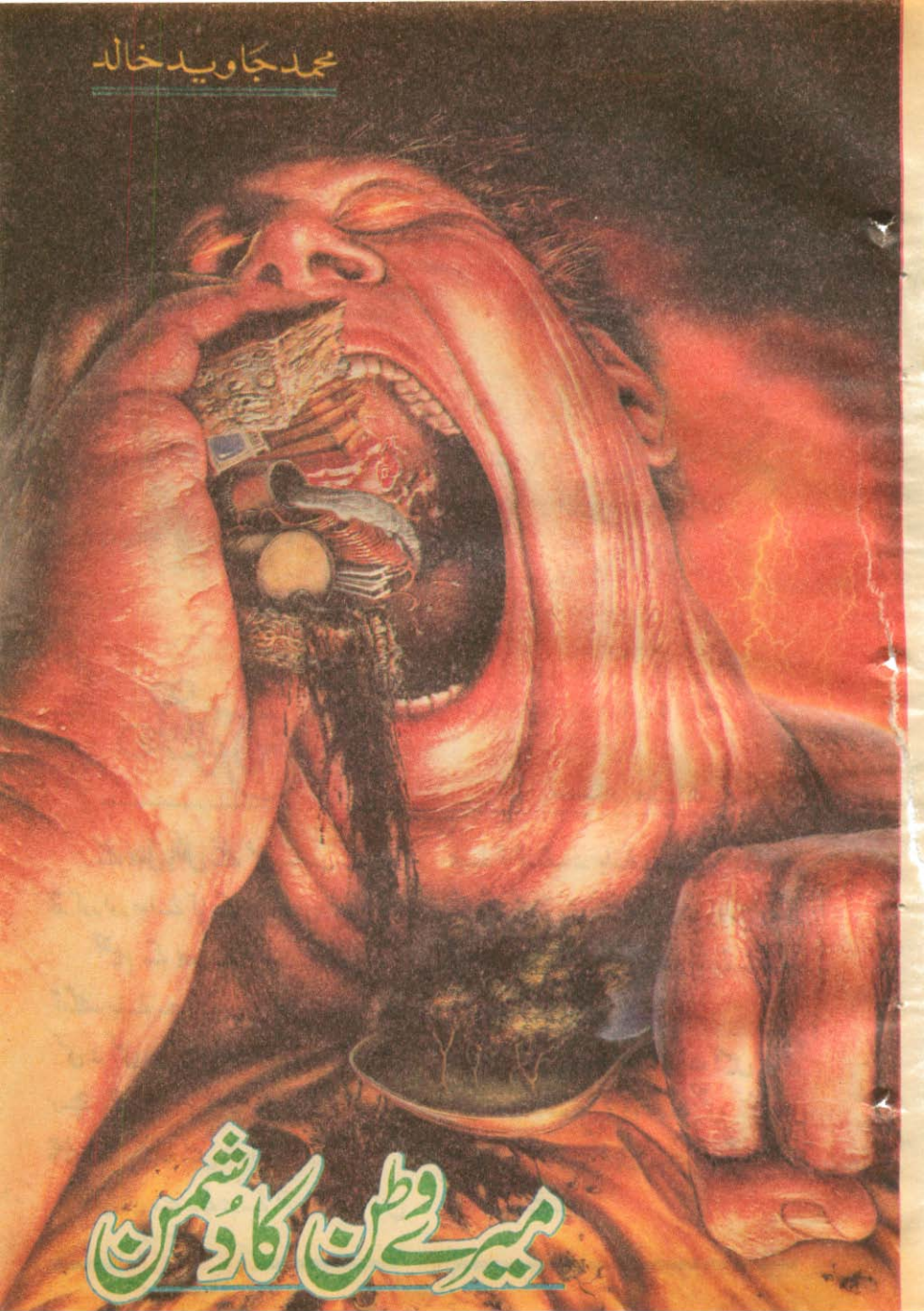

میرے وطن کا دشمن

مقدس موت

خلیل اشعت / ستار طاہر

ننھے بھائی بالکل ننھے نہیں۔ سب سے زیادہ قد آور اور سوائے آپا کے سب سے بڑے ہیں۔

تقسیم کے بعد سے تو ننھے بھائی پاکستان آ گئے۔ جانے سے پہلے ہی کئی سال سے ان سے کسی نہ کسی وجہ سے ملنا نہ ہو سکا۔ وہ آگرہ میں رہتے تھے اور ہم لکھنؤ کے بورڈنگ میں۔ چھٹیوں میں بھی وہ کہیں تھے اور ہم کہیں۔

آج ان سے ملے ہوئے تقریباً" بیس برس ہونے کو آئے۔ نہ جانے وہ کتنے بدل گئے ہوں گے۔ مگر مجھے تو وہی ننھے بھائی ہمیشہ یاد رہیں گے جو بہت لاڈ کیا کرتے تھے، بہت ستاتے تھے، اور کبھی کبھی تو ٹھکائی بھی کر دیتے تھے۔

مگر ٹھکائی سے زیادہ، جو بات ہمیں جلاتی تھی، وہ بیوقوف بنانے کی عادت تھی ننھے بھائی آئے دن نت نئے طریقوں سے ہم لوگوں کو الو بنایا کرتے تھے۔

ایک دن کہنے لگے :

"چمڑا کھاؤ گی؟"

ہم نے کہا :

"نہیں، تھو..... ہم تو چمڑہ نہیں کھاتے۔"

"مت کھاؤ!" یہ کہہ کر چمڑے کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لیا اور مزے مزے سے کھانے لگے۔

اب تو ہم بڑے چکرائے۔ ڈرتے ڈرتے ذرا سا چمڑا لے کر ہم نے زبان لگائی۔ ارے واہ کیا مزے دار چمڑا تھا کھٹا میٹھا.....

پھر ہم نے کہا :

"اور دیں ننھے بھائی۔"

"بس بھئی بس..... اب تو ختم ہو گیا۔"

"کہاں سے لائے تھے ننھے بھائی؟"

ننھے بھائی نے بتایا :

"ہمارا جوتا پرانا ہو گیا تھا، وہی کاٹ ڈالا۔"

"بھئی حد ہے، یعنی جوتا اتنا مزے دار ہوتا ہے! ہم کو خبر ہی نہیں تھی....."

جھٹ ہم نے اپنا جوتا چکھنے کی کوشش کی۔ اخ تھو!..... توبہ ..... مارے سڑاند کے ناک اڑ گئی!

"ارے بے وقوف، یہ کیا کر رہی ہو۔ تمہارے جوتے کا چمڑا اچھا نہیں ہے اور یہ ہے بھی بڑا گندا..... آپا کی جو نئی گرگابی ہے نا، اسے کاٹو تو اندر سے میٹھا میٹھا چمڑا نکلے گا۔" ننھے بھائی نے ہمیں رائے دی۔

اور بس ..... اس دن سے ہم آپا کی نئی گرگابی کی تاک میں لگ گئے، مگر آپا کی نئی گرگابی سخت لاڈلی تھی۔ گھر میں جب کبھی مہمان آتے ——— تب بڑے اہتمام سے گرگابی نکالی جاتی۔ ہماری فراک سے، چاہے وہ دھلی صفا کیوں نہ ہو، گرگابی کا خوب منہ چمکایا جاتا۔ گلابی موزے چڑھتے۔ ان پر وہ نازنین گرگابی پہنی جاتی۔ اسے پہن کر آپا یوں پھدک پھدک کر چلتیں جیسے پیروں میں پر لگ گئے ہوں۔

تو بس اس دن سے ہم نے گرگابی کو گلاب جامن سمجھ کر اسے تاڑنا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی منہ میں پانی بھر آتا۔ اف! وہ کھٹ مٹھی گرگابی، جس پر نیلے ساٹن کا پھندنا سجا تھا، بالکل چاکولیٹ کے کیک کی طرح ہمارے دل پر چھریاں چلاتی۔

عید کا دن تھا۔ آپا اپنی حسین اور مہ جبین گرگابی پہنے، پائنچے پھڑکاتی، سویاں بانٹ رہی تھیں۔ ہم ان کے پیروں کو ایسے گھور رہے تھے، جیسے بلی ترمال چوہے کو گھورتی ہے۔

ہماری نظر تو شاید چوک جاتی، ننھے بھائی کی نظر بھلا کیوں بخشتی۔ انہیں اس گرگابی سے اللہ

مارے کا بیر تھا' کیوں کہ انہیں جوتا نہیں دلایا گیا تھا اور آپا کو گرگابی دلا دی گئی تھی۔ آپا ظہر کی نماز پڑھنے جونہی کھڑی ہوئیں' ننھے بھائی نے ہمیں اشارہ کیا :

"اب موقع ہے' آپا نیت توڑ نہیں سکیں گی۔ بس۔"

"مگر کاٹیں کاہے سے؟" ہم نے پوچھا۔

"آپا کی صندوقچی میں سے سلمہ ستارہ کاٹنے کی قینچی نکال لاؤ۔"

ہم نے جونہی گرگابی کا بھورا ملائم چمڑہ نکال کر اپنے منہ میں رکھا' ہمارے سر پر دو سو چیلیں جھپٹ پڑیں۔ پہلے تو آپا نے ہماری اچھی طرح کندی کی۔ پھر پوچھا :

"مردار یہ کیا کر رہی ہے؟"

"کھا رہے ہیں۔" ہم نے نہایت مسکین صورت بنا کر بتایا۔ یہ کہنا تھا کہ سارا گھر ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا۔

"پاگل ہو گئی ہے!" کسی نے چلا کر کہا۔

"بے وقوف گندی۔"

"یہ اسے کیا ہو گیا ہے؟"

"اری جوتا کیوں کھا رہی تھی' نیک بخت؟"

ہماری تکا بوٹی ہو رہی تھی کہ ابا میاں آ گئے۔ مجسٹریٹ تھے' فوراً مقدمہ معہ خبیہ اور مقتول گرگابی کے' روتی پیٹتی آپا نے پیش کیا۔ وہ ابا میاں جو بڑے سے بڑے مقدمے چٹکیوں میں فیصل کر دیتے تھے' حیران رہ گئے۔ کبھی ہمیں دیکھتے' کبھی مقتول جوتے کو' اور پھر گہری سوچ میں پڑ جاتے۔

ادھر ننھے بھائی مارے ہنسی کے قلابازیاں کھا رہے تھے۔ ابا میاں نے عینک کے اوپر سے ہمیں دیکھا۔ نہایت غمگین آواز میں بولے :

"سچ بتاؤ' جوتا کھا رہی تھیں؟"

"ہاں" ہم نے روتے ہوئے اقبال کیا۔

"کیوں؟"

"میٹھا ہوتا ہے۔"

"جوتا میٹھا ہوتا ہے؟"

"ہاں۔" ہم پھر رینکے۔

"یہ کیا بک رہی ہے بیگم؟"

انہوں نے فکر مند ہو کر اماں کی طرف دیکھا۔ اماں بسورنے لگیں :

"یا خدا ایک تو لڑکی کی ذات' دوسرے جوتے کھانے کا چسکہ پڑ گیا تو نامراد کو کون قبولے گا۔"

ہم نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ "سچی بھئی چمڑا بہت میٹھا ہوتا ہے۔ ننھے بھائی نے ہمیں ایک دن کھلایا تھا۔" مگر کون سنتا تھا۔

"جھوٹی ہے ۔۔" ننھے بھائی صاف مکر

گئے۔ "بھلا میں اسے چمڑہ کیسے کھلا سکتا ہوں۔ چمڑہ کوئی کیسے کھا سکتا ہے، بکتی ہے۔"

اور بہت دنوں تک یہ معمہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ خود ہماری عقل گم تھی کہ یہ ننھے بھائی کے جوتے کا چمڑہ کیسا تھا جو اتنا لذیذ تھا۔

اور پھر ایک دن خالہ بی بریلی سے آئیں بقچیہ کھول کر انھوں نے پتوں میں لپٹا چمڑا نکالا۔ سب کو بانٹا۔ سب نے مزے مزے سے کھایا۔ اور ہم کبھی انہیں دیکھتے، کبھی چمڑے کے ٹکڑے کو، اور پھر ان تمام جوتوں کو یاد کرتے جو آپا کی گرگابی کھانے کی کوشش میں پڑے تھے۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ جسے ہم چمڑا سمجھتے تھے، وہ آم رس تھا۔ جسے آم کا پاپڑ بھی کہتے ہیں اور کسی ظالم نے آم کے رس کو سکھا کر لال چمڑے کی شکل کی یہ نانہجار مٹھائی بنا کر ہمیں جوتے کھلوائے۔

دو اور دو

پہلے زمانے میں لوگ دو اور دو کر کے چار بناتے تھے۔ زمانہ وسطیٰ میں دو اور دو کر کے پانچ بناتے تھے اور اب تو لوگ دو اور دو بائیس کرتے ہیں۔ آگے اللہ جانے کیا ہوگا کیونکہ شامت تو دو کی ہی آتی ہے۔

شیر نواز گل

آنکھ مچولی آپ کا اپنا پرچہ ہے۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ آپ کے مشوروں کی روشنی میں بہتر سے بہتر رسالہ ترتیب دیں اور بروقت آپ تک پہنچائیں۔ ہماری کاوش آپ تک اور آپ کی رائے ہم تک پہنچانے میں

ہمارے معاون ہمارے مددگار

صوبہ سرحد و پنجاب میں "آنکھ مچولی" کے ایجنٹ

۱	افضل نیوز ایجنسی	پشاور	۶۲۵۱۵
۲	سلطان نیوز ایجنسی	لاہور	۵۸۲۴۹
۳	راولپنڈی نیوز ایجنسی	راولپنڈی	۵۵۵۶۱۹
۴	اے ایس حامد نیوز سروس	ملتان	۴۳۳۱۰
۵	فیاض بک ڈپو	فیصل آباد	۲۷۴۰۶
۶	اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ	
۷	سعید بک اسٹال	گجرات	۳۶۳۹
۸	پاکستان اسٹنڈرڈ بک اسٹال	سرگودھا	۶۲۹۵۱
۹	خالد بک اسٹال	گجرات	۳۷۳۱
۱۰	طاہر نیوز ایجنسی	جہلم	
۱۱	چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یار خان	۲۶۲۶۷
۱۲	مسلم بک ڈپو	سرائے عالمگیر	
۱۳	رحمت بک اسٹال	اوکاڑہ	
۱۴	رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ ضلع بہاولنگر	
۱۵	ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ	۸۷۹۸۹
۱۶	سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال	
۱۷	اسلامی نیوز ایجنسی	وہاڑی	۲۸۸۹
۱۸	کیپٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور	۲۹۵۷

خط وکتابت کے لیے **سرکولیشن مینجر** ماہنامہ **آنکھ مچولی**، ا۔پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

مُسلمان کے مُسلمان پر حقوق

نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا:

"ایک مُسلمان کے دوسرے مُسلمان پر چھ حقوق ہیں"۔ پوچھا گیا یارسول اللہ! وہ کیا ہیں؟۔ آپؐ نے فرمایا "جب تم مُسلمان بھائی سے ملو تو اُس کو سلام کرو، جب وہ دعوت دینے کے لئے مدعو کرے تو اُس کی دعوت قبول کرو، جب وہ تم سے نیک مشورے کا طالب ہو تو اُس کی خیر خواہی کرو اور نیک مشورہ دو، جب اُس کو چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو اُس کے جواب میں یرحمک اللہ کہو، جب وہ بیمار پڑ جائے تو اُس کی عیادت کرو اور جب وہ مرجائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ۔"

(مُسلم)

عطیہ اشتہار

حاجی فتح محمد میموریل آرگنائزیشن

۷، حسن لشکری اسٹریٹ، بادشاہی روڈ کراچی

۸۷، بلاک نمبر ۷، خانیوال

پہلی بار

محمد صابر

"پہلی بار" کے نام سے آنکھ مچولی میں یہ سلسلہ پہلی بار ہی شروع ہو رہا ہے۔ رنگ و روشنی اور معرکہ و کش مکش کی اس دنیا میں ہر خاص و عام کام کسی نہ کسی نے پہلی بار ضرور کیا تھا۔ ایسا کب ہوا؟ کیسے ہوا؟ اور کیا کیا ہوا؟ تاریخ کے صفحات سے یہ منفرد اور حیرت انگیز معلومات آنکھ مچولی کے قارئین کی دلچسپی کی نذر ہیں۔

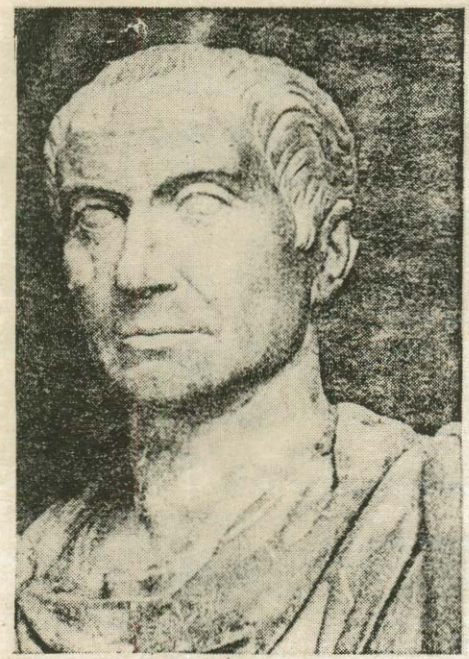

قدیم سلطنت روم کا عظیم فرماں روا جولیس سیزر دنیا کا پہلا حکمران تھا۔ جس نے فتوحات اور کارناموں کو مؤرخوں سے لکھوایا۔ جولیس سیزر نے اپنی فتوحات کی تاریخ مفصل انداز میں لکھوائی جو سادہ اور دلنشین تحریر کا عمدہ نمونہ تھی۔ جولیس سیزر نے اپنی سلطنت کی توسیع کے لئے دنیا کی عظیم طاقتوں سے جنگی معرکے کئے جن میں فرانس اور برطانیہ شامل ہیں۔ جولیس سیزر نہ صرف ماہر سپہ سالار تھا بلکہ اس کے ساتھ ہی مملکت کے انتظامی امور کو چلانے کے لئے تمام صلاحیتیں اس میں موجود تھیں۔ اس نے قدیم رومن سلطنت کا دستور بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ اس نے روم میں پانی کی فراہمی اور نکاسی کا مربوط نظام بھی وضع کیا۔ 44 ق۔م کو اسے قتل کردیا گیا۔

Reader's Digest
Trusted everywhere. By everyone.

ریڈرز ڈائجسٹ دنیا میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا رسالہ ہے۔ یہ رسالہ پہلی بار 1922ء میں شائع ہوا۔ ریڈرز ڈائجسٹ کے بانی ڈی وٹ ویلیس تھے۔ یہ رسالہ پہلی بار پانچ ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ اس وقت اس کے قارئین کی تعداد لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں میں ہے۔ یہ رسالہ دنیا کی 16 زبانوں میں شائع ہورہا ہے۔ اس کے علاوہ نابینا افراد کی سہولت کے لئے یہ رسالہ بریل سسٹم میں بھی شائع کیا جاتا ہے۔

☆ --- ☆ --- ☆

دنیا میں پہلی بار کاروبار مملکت کو چلانے کے لئے آئین یا دستور حمورابی نے متعارف کرایا۔ حمورابی کے وضع کردہ قوانین کو دنیا کے پہلے دستور کی حیثیت حاصل ہے۔ حمورابی دنیا کی قدیم تہذیب بابل کا حکمران تھا۔ وہ سلطنت بابل کا 43 سال تک حکمران رہا۔ حمورابی کا عرصۂ اقتدار 1792ء قبل مسیح سے شروع ہو کر 1750 قبل مسیح پر ختم ہوتا ہے۔

دنیا کا پہلا ڈاک ٹکٹ 6 جون 1840 کو جاری کیا گیا یہ ڈاک ٹکٹ "پینی بلیک" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی قیمت صرف ایک پینی تھی جبکہ براعظم ایشیا میں سب سے پہلا ڈاک ٹکٹ یکم جولائی 1852ء کو کراچی سے جاری کیا گیا۔

☆ --- ☆ --- ☆

دنیا کی پہلی خاتون صدر مملکت ہونے کا اعزاز ارجنٹائن کی ازابیل پیرون کو حاصل ہے۔ ازابیل پیرون (Isabel-Peron) اپنے شوہر اور سابق صدر جنرل جوان پیرون (Juan-Peron) کی موت کے بعد یکم جولائی 1974ء کو عہدہ صدارت پر فائز ہوئیں۔

☆ --- ☆ --- ☆

برطانیہ کے میتھو ویب (Webb Mathew) دنیا کے پہلے تیراک ہیں جنہوں نے انگلش چینل عبور کرنے کا اعزاز حاصل کیا انہوں نے یہ فاصلہ 21 گھنٹے اور 45 منٹ میں طے کیا۔ واضح رہے کہ انگلش چینل (Channel-English) انگلینڈ اور فرانس کے درمیان واقع ایک طویل آبی گزر گاہ ہے۔ اس کی کل لمبائی 563 کلو میٹر ہے۔ اور یہ "تیراکی" کے شائقین کے لئے ہمیشہ چیلنج (Challange) رہی ہے۔

مسلم دنیا کی پہلی خاتون سفیر ہونے کا اعزاز بیگم رعنا لیاقت علی خان کو حاصل ہے۔ انہوں نے یہ اعزاز اس وقت حاصل کیا جب وہ ستمبر 1954ء میں ہالینڈ میں پاکستان کی سفیر مقرر ہوئیں۔ بیگم رعنا لیاقت علی خان نے 1961ء تک سفارتی امور سرانجام دیئے۔

☆ --- ☆ --- ☆

سعودی عرب کے شہزادہ سلطان سلمان السعود کو دنیا کے پہلے مسلم خلا باز ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس کے علاوہ انہیں خلاء میں قرآن پاک کی سب سے پہلے تلاوت کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ وہ جون 1985ء میں امریکی خلا بازوں کے ہمراہ "خلائی شٹل" "ڈسکوری" کے ذریعے خلاء میں بھیجے گئے۔

☆ --- ☆ --- ☆

جدید بینکاری کا آغاز پہلی بار 1587ء میں ہوا جب آسٹریا کے دارالحکومت ویانا میں بینک ڈی ریالٹو نامی بینک کا قیام عمل میں آیا۔ یہ بینک 1619ء میں بینک ڈی گیرو (Bank Di Giro) نامی بینک میں ضم کردیا گیا جو 1805ء تک قائم رہا۔ 1661ء میں پہلی بار کسی بینک سے کرنسی نوٹ جاری کئے گئے اور یہ اعزاز بینک ڈی ریالٹو (Bank Di Rialto) ہی کو حاصل ہوا۔

رچرڈ نکسن عہدۂ صدارت سے مستعفی ہونے والے پہلے اور واحد امریکی صدر ہیں وہ جنوری 1969ء میں ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار ہوبرٹ۔ ایچ۔ ہمفرے (Hubert - H - Hamphrey) کو شکست دے کر امریکی صدر منتخب ہوئے تھے۔ اس سے قبل وہ سابق امریکی صدر آئزن ہاور کے دور حکومت میں نائب صدر کی حیثیت سے فرائض انجام دے چکے تھے۔

☆ --- ☆ --- ☆

دنیا میں پہلی بار انٹرنیشنل ٹریڈ فیئر یا بین الاقوامی تجارتی نمائش کا انعقاد 1851ء میں لندن میں کیا گیا۔ یہ تجارتی نمائش ہائیڈ پارک کے مقام پر منعقد ہوئی جو 141 دن جاری رہی۔

میں معاف کر دینا

احسان الحق حقانی

محمد سلیم کویت کا رہنے والا ایک شہری عرب تھا اور میڈیکل کالج میں داخلہ لینے کے لئے پاکستان آیا تھا۔ ابھی چونکہ داخلہ کی تاریخ میں بہت وقت تھا۔ اس لئے وہ اسلام آباد میں ہمارے ساتھ ہاسٹل میں رہتا تھا۔ اس کی آمد سے ہمارے ہاسٹل میں گویا زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر وقت ہنسی مذاق اور قہقہوں کی آواز۔ میں خود بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں عربی زبان سیکھ رہا تھا۔ محمد نے بھی انگریزی سیکھنے کے لئے یونیورسٹی آنا جانا شروع کر دیا۔ لیکن انگریزی کے اُستاد جب اس کی انگریزی میں کوئی غلطی نکالتے تو وہ بہت بُرا مناتا اور کہتا "نو پرو بلم، اُستاد کا کام سکھانا ہے، غلطیاں نکالنا نہیں۔"

یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب اسلام آباد میں مصر کے سفارت خانے میں بم کا دھماکہ ہوا تھا۔ چونکہ حکومت کے ایک وزیر نے اسلامی یونیورسٹی کے طلبہ پر شک ظاہر کیا تھا۔ اس لئے اسلام آباد میں مُقیم عربوں کے لئے شدید مشکلات پیدا ہوگئی تھیں۔ بین الاقوامی ایئرپورٹوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ کوئی بھی عرب پاکستان سے جانے نہ پائے۔ جابجا پکڑ دھکڑ اور تلاشیوں نے معزز عرب مسلمانوں کو سخت خوفزدہ کر دیا تھا اور محمد تو بیچارہ بہت ہی پریشان تھا۔ دن بھر ہاسٹل کے کمرے میں دُبکا رہتا تھا۔ اور امی ابو کو یاد کرتا رہتا۔ اس نے میڈیکل کالج میں داخلہ اور پاکستان میں قیام کے تمام ارادے ترک

کردیئے تھے۔ اور اُڑ کر کویت جانے کے لئے تڑپ رہا تھا لیکن ایئرپورٹ کے دروازے عربی بولنے والوں پر بند تھے۔

ہاسٹل کے رہنے والے تمام طلبہ اسے بہت دلاسہ دیتے تھے۔ جس کے نتیجہ میں اس کی پریشانی کم ہوگئی۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ وہ ایک بہادر نوجوان ہے۔ اور اسے پولیس سے قطعاً" ڈرنا نہیں چاہئے۔ اس دوران اس نے لاہور سے کویت جانے والے جہاز کا ٹکٹ خرید لیا۔ اور فیصلہ کیا کہ اگر لاہور ایئرپورٹ پر مجھے پکڑ کر جیل میں ڈال دیا گیا تو کوئی بات نہیں۔ انتظار ہی تو کرنا ہے۔ پھر جیل کے اندر اور باہر کا کیا سوال..... الانتظار اشد من الموت۔

جب اس نے اس طرح کا فیصلہ کیا تو بہت مطمئن ہوگیا بلکہ شیر ہوگیا اب لڑکے اسے ڈراتے تھے کہ پولیس آئی تھی اور تمہارا پوچھ رہی تھی یا اُردو اخبار دکھا کر کہتے کہ یہ دیکھو، لکھا ہے کہ مصری سفارت خانہ میں دھماکہ محمد نامی کسی کویتی نے کیا ہے۔ جس کی تلاش جاری ہے وغیرہ وغیرہ لیکن محمد نے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک دن ہم لڑکوں کو محمد کے خلاف ایک چھوٹی شرارت کرنے کی سُوجھی جس کے مرکزی کردار مقصود اور قاسم تھے جبکہ باقی لڑکوں نے چُپ سادھ کر شرارت کی حمایت کرنی تھی۔ اس شرارت میں، میں بھی شامل تھا۔

منصوبہ کے مطابق عابد صدیق نے کمشنر اسلام آباد کی طرف سے ایک وارنٹ تحریر کیا۔ جس میں محمد کو دہشت گردی اور دھماکہ کے الزام میں فوری گرفتار کرنے کا حکم تھا۔ عشا کے بعد پولیس کے دو سپاہی ہاسٹل آئے اور محمد سے پوچھ گچھ شروع کی۔

"ہم آپ کو مصری سفارت خانہ میں بم دھماکہ کے الزام میں فوری طور پر گرفتار کرنے آئے ہیں۔"

پولیس نے کہا۔

"لیکن مجھے دھماکہ سے کیا؟" محمد نے پریشان ہو کر کہا۔ "مجھے پاکستان اور مصر تو کیا، کسی کے ساتھ بھی کوئی دشمنی نہیں۔"

"یہ باتیں عدالت میں کیجئے گا" پولیس نے کہا۔ "ابھی چلو تھانے....."

"دیکھیں ..... میری امی میری جُدائی کے غم میں بیمار ہے۔ وہ ہسپتال میں ہے۔ میری بہن مصلّے پر کھڑی ہر وقت میرے لئے دُعائیں مانگتی ہے۔ میں بالکل بے قصور ہوں..... میں نے کچھ نہیں کیا..... میں تو..... میں تو..... دیکھیں میں تو بچہ ہوں۔" محمد نے پہلی بار خود کو بچہ تسلیم کیا۔ لیکن پولیس کہاں ماننے والی تھی۔ وہ اسے اُٹھا کر لے جانے لگے۔ جب وہ ٹیلیفون کے قریب سے

گزرنے لگے۔ تو اس وقت میں فون پر کمشنر سے ساتھ جعلی گفتگو میں مصروف تھا۔

"دیکھیں کمشنر صاحب آپ لوگ انگریزوں اور امریکیوں کو تو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ لیکن یہ ہمارا مُسلمان عرب بھائی ہے۔ تو اسے گرفتار کرنے لگے ہیں ..... دیکھیں وہ بالکل بچہ ہے اور سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کرسکے۔"

اتنے میں یاسر آگیا۔ انعام نے پولیس کو روک کر یاسر کا جعلی تعارف کرایا کہ لاہور پولیس کے کمشنر کا بیٹا ہے۔ اور یہ ضمانت دے دے گا کہ کل صبح ہم "ملزم" کو خود ہی تھانے حاضر کردیں گے۔ اور پولیس ہمارا اشارہ پاکر مان گئی اور محمد کا پاسپورٹ، ٹکٹ اور دوسرے کاغذات لے کر اسے چھوڑ دیا گیا۔

"یا احسان! باللہ العظیم ..... میں نے پوری دُنیا میں آپ جیسے اچھے دوست نہیں دیکھے۔"

اس نے لفظ "پوری" پر پورا پورا زور دیتے ہوئے کہا۔ آپ لوگوں نے اگر مجھے پولیس سے نہ چھڑایا ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا ....." یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

جب اس کی طبیعت ذرا سنبھل گئی تو ہم واپس ہاسٹل آگئے۔ اتنے میں، میں یاسر محمد کے کاغذات لے کر آگیا۔ اور کہا کہ "میرے ابو نے فون کیا تھا کہ کاغذات واپس کردو۔" اس لئے پولیس نے دے دیئے ہیں۔

محمد نے پہلے تو کاغذات چیک کئے۔ اور پھر ہم میں سے ہر ایک کو گلے لگا کر خوب رویا۔ ہم سب اپنے کئے پر بہت شرمندہ تھے اور یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اس کا ہر آنسو پہاڑ بن کر ہمارے دلوں پر پڑ رہا ہے۔ ہم سب خود کو مجرم کے کٹہرے میں کھڑے محسوس کررہے تھے لیکن اپنی شرارت کے جرم کے اعتراف کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔

اس وقت سے محمد کے جانے تک ہم ہر لمحہ اسی انتظار میں رہے کہ کب مناسب موقع ملتے ہی محمد کو حقیقت بتادیں۔ لیکن معاملہ اتنا سنجیدہ ہوگیا تھا کہ ہمیں اسے مذاق قرار دینے کی جرأت نہیں ہورہی تھی۔ ہم اپنے کئے پر بہت پشیمان تھے۔ لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا پھر محمد کے کویت جانے کا وقت آگیا اور وہ کویت سدھار گیا اب محمد کویت میں ہے شاید آنکھ مچولی میں چھپنے والی اس کہانی سے اسے ہماری شرارت کا پتہ چل جائے کہ یہ سب کچھ مذاق تھا۔ لیکن پچھتاوے کے اس بوجھ کا پتہ اسے کیسے چلے گا جو ہم تمام دوستوں کے دِلوں میں ہمیشہ رہے گا.....!!

ٹوٹی کہاں کمند

عادل منہاج

ایک بار پھر بتادوں جناب کہ ہر طرح کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔ مجھے کوئی الزام مت دیجئے گا۔"

"آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ میری تو ساری عمر شیروں اور چیتوں سے جنگ کرتے گزری ہے۔ آج رات بھوتوں اور چڑیلوں سے بھی نمٹ لیں گے۔" وہ مسکراتا ہوا بولا اور سامنے کھڑا ادھیڑ عمر شخص کندھے اچکا کر رہ گیا۔

وہ ایک مشہور شکاری تھا اس کی ساری عمر خطرناک جنگلوں میں گزری تھی۔ نہ جانے کتنے خطرناک جانوروں کا اس نے شکار کیا تھا۔ اب تو اسے شکار کے بغیر اپنی زندگی ادھوری محسوس ہونے لگی تھی۔ ان دنوں وہ افریقہ کے ایک دور دراز کے علاقے میں شکار کھیل رہا تھا۔ کافی دن جنگل میں گزارنے کے بعد وہ ایک چھوٹے سے شہر میں داخل ہوا اسے صرف رات گزارنے کے

لئے جگہ چاہئے تھی۔ صبح اس نے ایک نئے سفر پر روانہ ہوجانا تھا مگر اتفاق سے اس شہر میں صرف ایک ہی چھوٹا سا ہوٹل تھا اور وہ بھی ہاؤس فل تھا۔ کسی سرائے میں بھی جگہ نہ ملی۔ پھر اسے شہر کے کنارے ایک ٹیلے پر بنا چھوٹا سا خوبصورت مکان نظر آیا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہ آسیب زدہ مکان کے طور پر مشہور ہے اور کوئی ادھر کا رخ بھی نہیں کرتا۔ شکاری فوراً" اس مکان کے مالک سے ملا اور اس سے مکان میں رات گزارنے کی اجازت مانگی۔ مالک بہت حیران ہوا اور اسے سمجھایا کہ جب سے مکان پر آسیب نے قبضہ کیا ہے کوئی وہاں رہنے پر تیار نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے بھی چند لوگوں نے اس میں رہنے کی کوشش کی مگر صبح ان کی لاش ملی۔ اس سے شکاری کا اشتیاق اور بڑھ گیا۔ اس نے تو ساری عمر خطروں سے کھیلتے گزاری تھی اس نے سوچا کہ اس بار آسیب کا شکار کیوں نہ کیا جائے۔ کافی بحث کے بعد مالک نے اسے اس شرط پر رات گزارنے کی اجازت دے دی کہ اگر اس کے ساتھ کوئی بھی واقعہ پیش آیا تو اس کی ذمہ داری اس پر نہیں ہوگی۔

شکاری اپنا تھیلا کندھے سے لٹکائے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر مکان تک پہنچا۔ مکان کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ وہ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوگیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے دیواریں ٹٹول کر سوئچ تلاش کیا اور لائٹیں جلا دیں۔

"حیرت ہے یہاں تو ہر چیز بڑی صاف ستھری حالت میں ہے حالانکہ ایک عرصے سے یہاں کوئی نہیں آیا۔" شکاری بڑبڑایا۔ واقعی ایسا لگتا تھا کہ مکان کی باقاعدگی سے صفائی کی جاتی رہی ہے۔ اس نے پورے مکان کا جائزہ لیا۔ مکان میں چار کمرے، دو غسل خانے اور ایک باورچی خانہ تھا۔ چھت پر چھوٹا سا اسٹور تھا۔ آخر اس نے ایک کمرہ سونے کے لئے منتخب کیا۔ اپنا تھیلا میز پر رکھا اور پلنگ پر دراز ہوگیا۔ اس پر کافی تھکن طاری تھی اس لئے لیٹے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

"ٹھک ..... ٹھک ....." اس آواز کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کی آنکھ کیوں کھلی شاید وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ یہ سوچ کر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ مگر اسی وقت ٹھک ٹھک کی آواز دوبارہ سنائی دیں وہ چونک اٹھا۔

یہ تو شاید کوئی کھڑکی کا شیشہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ مم مگر کون ....." اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ مگر اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہ آیا۔

"مجھے لائٹ جلانی چاہئے۔" اس نے پلنگ

کے پیچھے دیوار پر لگا بٹن دبایا۔ مگر کچھ نہ ہوا۔

"یہ کیا مصیبت ہے۔ بلب کو بھی ابھی فیوز ہونا تھا۔" وہ جھلا گیا۔

"ٹھک..... ٹھک....." اس بار آواز بہت واضح تھی وہ اچھل پڑا۔

"مم .... مجھے اٹھ کر دیکھنا ہوگا۔ یہ آسیب مجھے خوفزدہ نہیں کر سکتا۔ وہ چارپائی سے اترا اور اپنے چپل تلاش کیے مگر اسے ناکامی ہوئی۔ "یہ چپل کہاں چلے گئے" اس نے فرش پر ادھر ادھر ہاتھ مارے مگر چپل کہیں ہوتے تو ملتے۔ تنگ آکر وہ ننگے پاؤں ہی کھڑکی کی طرف بڑھا ہر طرف اندھیرے کا راج تھا۔ کھڑکی کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا اور کھڑکی کے شیشوں سے باہر جھانکا مگر سوائے اندھیرے کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے چٹخنی گرائی اور ایک دم کھڑکی کھول دی۔ ایک سرد ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ ساتھ ہی ایک زور دار چیخ سنائی دی اور کوئی چیز پھڑپھڑاتی ہوئی کمرے میں آگھسی۔ کوئی اور ہوتا تو ایسے ماحول میں یہ چیخ سن کر خوفزدہ ہوجاتا۔ مگر وہ ایک شکاری تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ کسی الو کی چیخ تھی۔

"دھت تیرے کی یہ تو الو ہے۔ مم۔ مگر کیا یہ الو کھڑکی پر ٹھک ٹھک کر رہا تھا۔" اس نے سوچا کمرے میں پھڑپھڑاہٹ کی آواز اسی طرح گونج رہی تھی مگر اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

"مم۔ مجھے کسی طرح روشنی کرنی ہوگی۔ اس طرح یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ ہاں میرے تھیلے میں ٹارچ موجود تو ہے" سونے سے پہلے اس نے اپنا شکاری تھیلا میز پر رکھا تھا۔ وہ اندازے سے میز کی طرف بڑھا اور ٹٹول کر تھیلا اٹھانا چاہا۔ مگر یہ کیا۔ میز پر تو تھیلا تھا ہی نہیں۔

"یہ کیا ..... میرا تھیلا کہاں گیا۔" اس نے میز پر ادھر ادھر ہاتھ مارا۔ اس وقت اس کا ہاتھ کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ گر گئی۔ اس کے ہاتھ گیلے ہوگئے۔

"شش ... شاید جگ الٹ گیا۔ رات میں نے پانی بھر کر رکھا تھا۔ مگر تھیلا کدھر ہے" جگ الٹنے کی وجہ سے میز بھی گیلی ہوگئی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھوں پر چپچپاہٹ سی ہو رہی تھی۔ پھر نہ جانے کیوں وہ خوفزدہ ہوگیا۔

اور اسی وقت کمرے کا بلب جل اٹھا۔ ایک دم تیز روشنی ہوگئی۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے ایک دم آنکھیں بھینچ لیں اور چند سیکنڈ بعد کھولیں۔ وہ میز کے سامنے کھڑا تھا۔ مگر اس کے سامنے جو منظر تھا وہ بے حد خوفناک تھا۔ میز پر جگ الٹا پڑا تھا اور پوری میز پر سرخ سرخ خون ہی خون پھیلا ہوا تھا اس نے گھبرا کر

افریقی عقاب

افریقی عقاب ۱۰۰ میل فی گھنٹہ سے بھی زیادہ رفتار حاصل کرسکتے ہیں۔ رکنے کے لئے انہیں صرف ۲۰ منٹ کا فاصلہ طے کرنا ہوتا ہے۔

اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ دونوں ہاتھ بھی خون سے بھیگ رہے تھے۔

"یہ ..... یہ ..... کیا میں نے تو رات جگ میں پانی بھر کر رکھا تھا۔ یہ پانی خون میں کیسے تبدیل ہوگیا۔" اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ اپنی پوری زندگی میں اس نے شکار کے دوران نہ جانے کتنے جانوروں کا خون کیا تھا اور خون بہتے دیکھا تھا۔ مگر اس وقت اس کی طبیعت نہ جانے کیوں متلا گئی۔ اسی وقت اس کے عقب میں پھڑپھڑاہٹ گونجی تو اسے وہ الو یاد آیا جو کمرے میں آگھسا تھا۔ وہ تیزی سے مڑا۔ مگر یہ کیا ..... ایک ایک اور دلخراش منظر اس کے سامنے تھا۔ کمرے میں واقعی ایک الو تھا مگر پورا نہیں ادھورا الو۔ اسے صرف الو کا چہرہ نظر آرہا تھا اس کا باقی جسم غائب تھا اور الو کا وہ منحوس چہرہ ادھر سے ادھر ڈول رہا تھا۔ نہ اس کا جسم تھا نہ پر مگر پھڑپھڑاہٹ کی آواز اسی طرح گونج رہی تھی۔

اچانک الو کا چہرہ تیزی سے اس کی طرف لپکا جیسے اس پر حملہ کرنے والا ہو۔ وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹا میز سے ٹکرا گیا اور نیچے گرا۔ میز کا کونا اس کے سر میں لگا اس نے بے اختیار خون آلود ہاتھ سے سر تھام لیا۔ اسی وقت اس نے دیکھا کہ الو کا چہرہ پھر تیزی سے اس کی طرف آرہا تھا۔ کئی بار خطرناک جنگلوں میں شیروں، گینڈوں اور بھیڑیوں نے اس پر حملہ کیا تھا مگر وہ کبھی نہ گھبرایا اور ہمیشہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے خطرے کا مقابلہ کیا مگر اس وقت وہ اس ادھورے الو کے حملوں سے بری طرح خوفزدہ ہوگیا تھا۔ وہ تیزی سے فرش سے اٹھا اور دروازے کی طرف دوڑا۔ مگر یہ کیا .... دروازہ باہر سے کسی نے بند کردیا تھا۔ اس نے دروازے کو جھٹکے دیے اسی وقت اسے محسوس ہوا کہ جیسے الو کا چہرہ اس کی گردن سے ٹکرایا ہے۔ اسے گردن میں شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی اور .....

ابھی میں ناول یہیں تک پڑھ پایا تھا کہ لائٹ چلی گئی۔

"اس لائٹ کم بخت کو بھی ایسے ہی وقت جانا ہوتا ہے۔ اچھا خاصا ناول پڑھ رہا تھا۔ کل لائبریری میں واپس بھی کرنا ہے۔ خیر تھوڑے سے ہی صفحے رہ گئے ہیں۔ صبح صبح اٹھ کر پڑھ لوں گا۔" میں نے سسپنس اور ایڈونچر سے بھرپور ناول الماری میں رکھا اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔

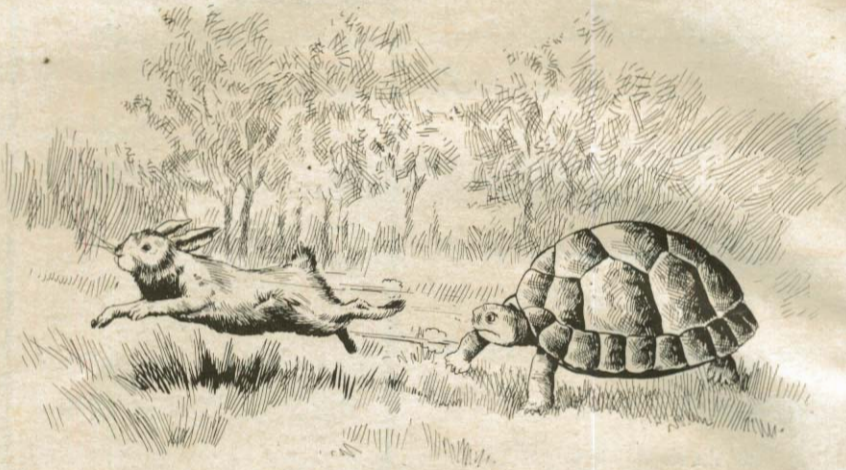

کچھوا اور خرگوش

ابنِ انشاء

ایک تھا کچھوا' ایک تھا خرگوش۔ دونوں نے آپس میں دوڑ کی شرط لگائی۔ کوئی کچھوے سے پوچھے کہ "تو نے کیوں لگائی؟ کیا سوچ کر لگائی؟" دنیا میں احمقوں کی کمی نہیں' ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ طے یہ ہوا کہ دونوں میں سے جو نیم کے ٹیلے تک پہلے پہنچے وہ فاتح سمجھا جائے۔ اسے اختیار ہے کہ ہارنے والے کے کان کاٹ لے۔

دوڑ شروع ہوئی۔ خرگوش تو یہ جا وہ جا۔ پلک جھپکنے میں وہ خاصی دور نکل گیا۔ میاں کچھوے وضعداری کی چال چلتے منزل کی طرف رواں ہوئے' تھوڑی دور پہنچے تو سوچا بہت چل لئے اب تھوڑا آرام بھی کرنا چاہئے۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنے شاندار ماضی کی یادوں میں کھو گئے۔ جب اس دنیا میں کچھوے راج کیا کرتے تھے۔ سائنس اور فنون میں ان کا بڑا نام تھا۔ یونہی سوچتے میں ان کی آنکھ لگ گئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ خود تو تخت شاہی پر بیٹھے ہیں باقی زمینی مخلوق شیر' چیتے' خرگوش' آدمی وغیرہ ہاتھ

بیگ تو کھل جائے

یہ واقعہ میرے انکل کے دوست کے ساتھ پیش آیا۔ انہی کی زبانی سنیے ۔ ایک دن میرے بیٹے کی طبیعت خراب ہوگئی۔ میں بھاگا بھاگا ڈاکٹر کے پاس گیا اور التجا کی کہ مہربانی کر کے میرے ساتھ چلئے۔ ڈاکٹر صاحب اپنا بیگ لے کر میرے ساتھ چل پڑے۔ میں ڈاکٹر صاحب کو لے کر اپنے گھر آیا اور انہیں اس کمرے میں لے گیا۔ جہاں میرا بیٹا بے ہوش پڑا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ باہر چلے جائیں۔ میں باہر آکر دروازے کے پاس کھڑا ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب نے دروازہ کھولا اور مجھ سے کہا "آپ کے پاس پیچ کس ہے؟" میں نے پیچ کس لا کر انہیں دے دیا اور وہ کمرے میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحب پھر باہر آئے اور بولے "ہتھوڑا لادیں۔" میں ہتھوڑا لے آیا۔ چند منٹوں بعد انہوں نے پھر باہر آکر کہا۔ "قینچی ہوگی؟" میں بہت پریشان ہوا۔ میں نے ان سے پوچھا۔ "خدا کے لئے ڈاکٹر صاحب مجھے اتنا تو بتادیں کہ میرے بیٹے کو کیا تکلیف ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "یہ بھی بتادوں گا۔ پہلے میرا بیگ تو کھل جائے؟"

مرسلہ : ایم وقاص انجم، لاہور

ہے۔ میں بھی کتنے عظیم ورثے کا مالک ہوں۔ واہ بھئی میرے کیا کہنے۔"

جانے کتنا زمانہ سوئے رہے تھے۔ جب جی بھر کر سستا لئے تو پھر ٹیلے کی طرف رواں ہوئے۔ وہاں پہنچے تو خرگوش کو نہ پایا۔ بہت خوش ہوئے اپنے کو داد دی کہ "واہ رے مستعدی میں پہلے پہنچ گیا بھلا کوئی میرا مقابلہ کر سکتا ہے؟" اتنے میں ان کی نظر خرگوش کے ایک پلے پر پڑی جو ٹیلے کے دامن میں کھیل رہا تھا۔ کچھوے نے کہا۔ "اے برخوردار تو خرگوش خان کو جانتا ہے؟"

خرگوش کے بچے نے کہا۔ "جی ہاں جانتا ہوں میرے ابا حضور تھے۔ معلوم ہوتا ہے آپ ہی وہ کچھوے میاں ہیں جنہوں نے ابا جان سے شرط لگائی تھی۔ وہ تو پانچ منٹ میں یہاں پہنچ گئے تھے۔ اس کے بعد مدتوں آپ کا انتظار کرتے رہے۔ آخر انتقال کر گئے جاتے ہوئے وصیت کر گئے تھے کہ کچھوے میاں آئیں تو ان کے کان کاٹ لینا۔ اب لائیے ادھر کان۔"

کچھوے نے فوراً اپنے کان اور اپنی سری خول کے اندر کر لئے۔ اور آج تک چھپائے پھرتا ہے۔

ابن انشاء کی "اردو کی آخری کتاب" سے اقتباس)

●●

باندھے کھڑے ہیں۔ یا فرشی سلام کر رہے ہیں۔ آنکھ کھلی تو ابھی سستی باقی تھی۔ بولے "ابھی کیا جلدی ہے؟ اس خرگوش کے بچے کی کیا اوقات

اگر آپ متحد ہیں
تو دنیا کی کوئی
بھی طاقت
آپ کو نقصان
نہیں پہنچا سکتی

قائداعظم

میٹھے جوتے

عصمت چغتائی

چوک میں کھڑا وہ دل میں دعائیں مانگ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ حرکت نہیں کر رہے تھے۔ چہرے سے بھی کسی پریشانی کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ وہ آنے جانے والوں کو مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ البتہ اس کے دل میں بے چینی اور پریشانی کا سمندر موجزن تھا۔ دل ہی دل میں وہ دعا مانگ رہا تھا۔

اس کی ماں کئی دنوں سے بیمار تھی اور کئی دنوں سے اسے کوئی مزدوری یا کوئی کام نہیں ملا تھا۔ گھر میں جو کچھ تھا ختم ہو گیا تھا۔ اور پچھلی رات اس کی ماں کی حالت یکدم اتنی بگڑ گئی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ چند منٹوں تک اس کی ماں بے ہوش رہی پھر اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ خدا نے اس کی فریاد سن لی ہے اور اس کی ماں زندہ ہے۔ لیکن بدستور بیمار تھی، شدید بیمار۔ اسے دوا اور خوراک کی ضرورت تھی اور اسے کئی دنوں سے

کوئی کام نہ ملا تھا۔ کوئی مزدوری نہ ملی تھی۔

وہ رات بھر ماں کے پاس بیٹھا رہا۔ کبھی اس کی ماں اونگھنے لگتی اور کبھی کراہنے لگتی۔ گھر میں دودھ کی ایک بوند تک نہ تھی۔ نہ پھل نہ کھانے کو کچھ اور۔ اس کو علم تھا کہ اس کی ماں بے حد کمزور ہوگئی ہے۔ اسے اچھی غذا کی ضرورت تھی لیکن یہ سب کچھ حاصل کرنا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ ہر روز مزدوری کے لئے نکلتا تھا مگر اب تو مزدوری بھی کئی کئی دن نصیب نہ ہوتی تھی۔

اپنے وطن سے دور وہ اس کیمپ میں زندگی گزار رہے تھے۔ جہاں ان کی طرح کے لٹے پٹے ہزاروں فلسطینی جلا وطنی اور غریب الوطنی کے دن پورے کر رہے تھے۔ سبھی نادار تھے، محتاج تھے۔ دوسروں کی امداد کے انتظار میں سسک سسک کر دن گزار رہے تھے۔ **صعیب** کو یاد تھا کہ اس کا باپ یہودیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ فلسطین کے ایک پیارے سے قصبے میں ان کا اپنا گھر تھا۔ اپنی زمین تھی مگر اب ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ گھر نہ زمین اور ایک کیمپ میں زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ **صعیب** اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا تھا۔ اس کی عمر سترہ سال تھی۔ اب وہ ہر صبح چوک میں جاکر کھڑا ہوتا کہ وہاں سے کوئی اسے مزدوری مل جائے۔

اسی چوک میں اس کی طرح کے کتنے ہی فلسطینی کھڑے ہوتے تھے۔ یہ سب اس کی طرح پریشان حال ہوتے تھے، ان کے چہرے غربت اور بے بسی کا آئینہ بنے ہوتے اور جب کوئی شخص ان کی طرف آتا تو وہ سب اس کی طرف تیزی سے لپکتے کہ آنے والا شخص ان کو کام دے دے۔ ہر شخص ضرورت مند تھا اور ضرورت نے ان کو خود غرض بھی بنادیا تھا۔

صعیب بھی انہی میں کھڑا ہوتا۔ ان لوگوں میں بوڑھے بھی تھے۔ ادھیڑ عمر بھی اور جوان بھی لیکن ان میں **صعیب** جیسا خوبرو اور معصوم نوجوان کوئی نہ تھا۔ اکثر اس کو ناتجربہ کار سمجھ کر بھی نظرانداز کردیا جاتا تھا۔ اسے اس رویے اور سلوک پر کوئی افسوس نہ ہوتا، اس کا دل تو ان لوگوں کو دیکھ کر روتا تھا جو بوڑھے تھے لیکن روزی کی تلاش میں نکل آئے تھے۔ سخت سردیوں میں بھی صبح سویرے وہاں چوک میں پہنچے ہوتے۔ وہ ناکافی کپڑوں کی وجہ سے کپکپا رہے ہوتے لیکن جمے رہتے کہ شاید کوئی کام مل جائے اور اکثر ان میں سے ہر روز ناکام و نامراد واپس جایا کرتے تھے۔

صعیب اس چوک میں کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ بظاہر مطمئن تھا۔ بھولپن اور معصومیت نے اس کی نوجوانی کو دلکش بنادیا تھا وہ دل ہی دل میں خدا

سے دعا مانگ رہا تھا کہ آج اسے مزدوری مل جائے تاکہ وہ اپنی ماں کے لئے دوائی اور کھانا لے کر گھر جاسکے۔ اپنی ماں کا تصور ہی اس کے لئے بڑا اذیت ناک بن چکا تھا۔ دل ہی دل میں دعا مانگتے ہوئے بھی وہ ماں کے لفظ اور تصور سے کانپ اٹھتا اور دل ہی دل میں سوچتا۔ میری اکیلی اور بیمار ماں جانے کس حال میں ہوگی۔ اس کی دیکھ بھال کرنے والا بھی تو کوئی نہیں یا خدا' اے سب کے پروردگار! میری ماں کو صحت دے۔

دن کے دس بج گئے۔ کوئی شخص نہ آیا جو **صعیب** کو پکارتا' اسے اشارہ کرتا اور اسے کام پر لے جاتا۔ وہ اب مایوس ہونے لگا تھا۔ روز مرہ کے تجربے نے اسے سکھادیا تھا کہ مزدوری صبح کے وقت ہی ملتی ہے۔ جوں جوں دن چڑھتا جاتا ہے کام ملنے کے امکانات کم ہوتے جاتے ہیں۔ اس نے اپنے دل میں خدا سے پوچھا۔

"کیا میں آج بھی خالی ہاتھ لوٹوں گا؟"

صعیب کا جی چاہا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے' چیخے اور خدا کو پکارے لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا دیئے رکھا اور کھڑا رہا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مایوسی اس کے دل پر گہرے بوجھ کی طرح بیٹھ گئی۔ اسے صاف نظر آنے لگا کہ اب کوئی نہیں آئے گا۔ اب مزدوری ملنے کا کوئی امکان نہیں۔ ماں کو خوراک اور دوا کی ضرورت تھی۔ اسے خود بھی شدید بھوک لگ رہی تھی۔ کل دوپہر سے اس نے کچھ نہ کھایا تھا۔ اور اب پھر دوپہر ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے اردگرد دیکھا۔ اس کے پاس کھڑے اس جیسے بے روزگاروں کی تعداد میں کمی ہو چکی تھی۔ ان میں سے بہت سے مایوس ہو کر جا چکے تھے۔ جو کھڑے تھے وہ زیادہ تر بوڑھے تھے۔

مایوس ہو کر **صعیب** بھی وہاں سے چل پڑا۔ اس نے آس پاس بھی نگاہ نہ ڈالی۔ وہ چلتا رہا۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ سڑکوں پر کتنی گہما گہمی ہے، کتنی رونق ہے' لوگ تھیلے بھر بھر کر پھل خرید رہے ہیں۔ اس نے کچھ بھی نہ دیکھا۔ اس کا ذہن سوچوں سے خالی ہو چکا تھا۔ وہ چلتا رہا۔ جیسے اپنے آپ کو گھسیٹ رہا ہو۔ اچانک اس کے کانوں میں آواز آئی۔

صعیب کے قدم رک گئے۔ لیکن دوسرے لمحے وہ پھر حرکت میں آگئے۔

"رک جاؤ۔" **صعیب** کو آواز ایک بار پھر سنائی دی۔

"میں نے تمہیں ہی آواز دی ہے۔"

صعیب کے قدم پھر رک گئے۔ مایوسی میں اس نے سوچا کوئی اسے کیوں بلا رہا ہے۔ اسے اس سے کیا کام ہو سکتا ہے؟ کام کا خیال ذہن میں آیا تو وہ مڑا شاید اسی سے کوئی کام مل جائے۔

آواز قریبی عمارت کی پہلی منزل سے آئی تھی۔ بالکونی میں ایک عورت کھڑی تھی۔

"دروازہ کھلا ہے" اس نے کہا۔ "اوپر آجاؤ۔"

اس کے لہجے میں ایک عجیب سی اپنائیت اور مٹھاس تھی۔ صعیب ہچکچاتا رہا۔

"اوپر آجاؤ۔" عورت نے کہا۔ "کیا تم بہرے ہو؟"

صعیب گھبرا گیا۔ اس نے ہمت کی اور بڑی مشکل سے اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ "کوئی کام مل سکتا ہے؟"

"ہاں کام ہے" عورت نے کہا۔ "جلدی سے اوپر آجاؤ۔"

صعیب ہچکچاتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

عورت نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور پھر بولی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"صعیب بن اشتر۔" اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"تم عرب ہو؟"

"ہاں فلسطینی عرب ہوں۔"

"اوہ ....." عورت نے قدرے حیرت کا اظہار کیا اور پوچھا۔

"کہاں رہتے ہو؟"

"کیمپ میں ..... فلسطینی مہاجروں کے کیمپ میں۔"

"کیا کام کرتے ہو؟" عورت نے پوچھا۔

"مزدوری کرتا ہوں۔"

"اچھا، تو تم مزدوری کرتے ہو۔" عورت مسکرائی۔ "میرا ایک کام کردو گے؟"

"کیسا کام؟" صعیب نے پوچھا۔

"میرا کچھ سامان ہے جو اسٹیشن تک پہنچانا ہے۔ یہاں سے تمہیں نیچے لے جانا ہوگا اور پھر گلی سے باہر تک خود ہی اٹھا کر لے جانا پڑے گا۔ گلی کے باہر جاکر تم کوئی ٹیکسی لے لینا اور اس میں اسے لاد کر اسٹیشن تک چلے جانا۔ وہاں یہ سامان تم گڈس آفس تک پہنچا دینا۔ اسے وہاں رکھ کر چلے آنا۔ میرا کوئی آدمی وہاں خود ہی پہنچ جائے گا اور اس بکس کو پہچان کر اسے بک کرا دے گا یہ کام کرسکو گے؟"

"جی ہاں ضرور کروں گا۔ مجھے معاوضہ کیا ملے گا؟" صعیب نے پوچھا۔

اسے کام ملنے کی بڑی خوشی ہو رہی تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا "اب میں ماں کے لئے کھانا لے کر گھر جاؤں گا۔ آج ماں بھوکی نہیں سوئے گی۔ ہاں اسے میں دودھ بھی لا کر دوں گا اور پھل بھی۔"

"میں تمہیں تمہاری مزدوری اور ٹیکسی کا کرایہ تیس لبنانی پونڈ دے سکتی ہوں۔" عورت

نے کہا۔

صعیب تیس لبنانی پونڈ سن کر سوچنے لگا کہ "یہاں سے اسٹیشن تک ٹیکسی والا کتنا کرایہ لے گا اور مجھے کیا بچے گا؟" بے چارے کو کبھی ٹیکسی میں بیٹھنا نصیب نہ ہوا تھا۔ اس لئے اسے اندازہ نہیں تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" عورت بولی "یہاں سے ٹیکسی کا کرایہ زیادہ سے زیادہ دو تین لبنانی پونڈ لگے گا۔ اس سے زیادہ نہیں۔"

"واقعی!" بے اختیار صعیب کے منہ سے نکلا۔ اگر چار پانچ پونڈ کرایہ لگ جائے تو اسے پچیس پونڈ کی بچت ہو سکتی تھی۔ اس سے وہ ماں کے لئے دوائی بھی لے کر جا سکتا تھا۔ اور گھر میں چند دنوں کے لئے کھانے پینے کی چیزیں بھی آسکتی تھیں۔

"وقت بہت کم ہے۔" عورت نے کہا۔ "اگر تمہیں منظور ہو تو بکس اٹھاؤ اور چلے جاؤ ورنہ میں کسی اور کو بلا لیتی ہوں۔"

"منظور ہے۔" صعیب نے کہا ..... "سامان کہاں ہے اور مجھے مزدوری کب ملے گی؟"

"ابھی لے لو۔" عورت نوٹ گنتے ہوئے بولی۔ "یہ لو تیس لبنانی پونڈ۔"

صعیب نے تیس لبنانی پونڈ لے کر جلدی سے اپنی جیب میں رکھے۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ آج نہ صرف یہ کہ اسے مزدوری ملی تھی بلکہ ایسی معقول مزدوری ملی تھی کہ وہ اس کے معاوضے سے کئی دن تک گھر کے اخراجات سے بے فکر ہو سکتا تھا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" عورت نے کہا۔

صعیب اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس نے یہ بھی محسوس نہ کیا کہ گھر خالی ہے۔ کسی کمرے میں کوئی انسان اور سامان دکھائی نہیں دے رہا۔ اور اس گھر کی ایسی حالت ہے جیسے اس میں مہینوں سے کوئی شخص نہ رہا ہو۔ گھر ویران اور سنسان پڑا تھا۔ وہ عورت کے پیچھے چلتا رہا۔ اس کا ذہن اپنے ہی خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ وہ آج کون کون سی چیز کس مقدار اور کتنی تعداد میں خرید کر گھر لے جائے گا۔

ایک کمرے میں رک کر عورت نے کہا۔ "وہ سامنے بکس پڑا ہے۔ اسے اٹھا کر لے جاؤ۔"

صعیب نے اس بکس کی طرف دیکھا۔ کالے رنگ کا بکس تھا۔ نہ زیادہ بڑا نہ چھوٹا۔

"اٹھا لو گے؟" عورت نے پوچھا۔

صعیب نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے بکس کو اٹھا کر اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ بکس خاصا وزنی تھا۔ کم از کم ایک من وزن کا تو ہو گا۔ لیکن وہ اتنا وزن اٹھا سکتا تھا۔ اور پھر

فاصلہ ہی کتنا تھا۔ یہاں سے اسے سڑک تک جانا تھا۔ اور پھر ٹیکسی.....

"جاؤ اب" عورت نے کہا۔ "اسے گڈس آفس میں چپکے سے کہیں رکھ کر خود چلے جانا۔"

"اچھا جی۔" صعیب نے کہا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی اس محسنہ کا شکریہ ادا کرے جب وہ سیڑھیوں کے سرے پر پہنچے تو عورت نے پھر کہا۔

"یاد رکھو، جیسے کہا ہے ویسے ہی کرنا۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" صعیب نے جواب دیا۔ اس نے پوچھا۔

"کیا پھر کبھی کام مل سکے گا؟"

عورت مسکرا دی اور بولی۔ "نہیں لیکن ضرورت ہوئی تو میں تمہیں کیمپ سے بلوا بھیجوں گی۔ جاؤ دیر نہ کرو۔"

صعیب بکس اٹھائے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ گلی میں پہنچ کر اس نے پہلی بار دیکھا کہ یہ ایک سنسان گلی تھی۔ یہاں کسی گھر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ وہ اس گلی سے گزرتا آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس کا کندھا دکھنے لگا تھا۔ اس نے بکس کو دوسرے کندھے پر رکھا اور سوچا کہ اب سڑک آتی ہی ہوگی لیکن اس گلی کے ختم ہونے کے بعد دوسری گلی آگئی تھی۔ سڑک ابھی دور تھی جانے وہ چوک سے بے خیالی میں کتنی دور نکل آیا تھا۔ اس کا ایک کندھا بوجھ سے تھک جاتا تو وہ بکس کو دوسرے کندھے پر رکھ لیتا۔ وہ ہانپنے لگا تھا۔ بھوک اور رات بھر کے جاگنے کی وجہ سے وہ کمزور ہوگیا تھا۔ پھر بھی وہ ہمت کئے آگے بڑھتا چلا گیا اور پھر جب وہ پسینے میں بالکل نہا گیا تو اسے سڑک دکھائی دی۔

سڑک کے کنارے اس نے بکس اتار کر رکھ دیا اور پسینہ خشک کرنے لگا۔ پھر اسے ایک ٹیکسی دکھائی دی۔ اس نے ہاتھ ہلایا تو ٹیکسی اس کے پاس آکر رک گئی۔

"ریلوے اسٹیشن کے کتنے پیسے لوگے؟"

ٹیکسی ڈرائیور نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا اور بولا

"جتنے پیسے میٹر پر بنیں گے۔"

"کتنے پیسے بن جائیں گے؟" صعیب نے پوچھا۔

"یہی دو اڑھائی لبنانی پونڈ۔"

"اچھا تو مجھے ریلوے اسٹیشن لے چلو۔" یہ کہہ کر صعیب نے بکس اٹھا کر ٹیکسی کی چھت کے اوپر رکھ دیا۔

ٹیکسی میں بیٹھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ٹیکسی چل پڑی۔ کچھ دیر بعد ٹیکسی ریلوے اسٹیشن کے سامنے رک گئی۔

"اتر جاؤ اب۔" ڈرائیور نے اسے کہا۔

"گڈس آفس کہاں ہے؟" صعیب نے پوچھا۔

"یہ نیچے اتر کر کسی سے پوچھنا تین لبنانی پونڈ

کرایہ دے دو۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔ حالانکہ میٹر پر بمشکل دو لبنانی پونڈ بھی نہ بنے تھے۔

صعیب نے اسے پیسے ادا کئے۔ بکس اتارا اور اسے کندھے پر رکھ کر چل پڑا۔ ریلوے اسٹیشن بہت بڑا تھا۔ لوگوں کا ہجوم تھا۔صعیب کو بڑی دقت پیش آرہی تھی کہ وہ کس طرف جائے۔ کس سے پوچھے؟ وہ اسٹیشن کی عمارت کے قریب پہنچ گیا اور ایک شخص سے پوچھا۔

"گڈس آفس کہاں ہے؟"

اس شخص نے پہلے تو اس کے کندھے پر رکھے ہوئے سیاہ بکس کو پھر صعیب کو غور سے دیکھا اور بولا۔"ادھر کہاں آنکلے؟ گڈس آفس تو پیچھے رہ گیا۔" یہ کہہ کر وہ صعیب کو گڈس آفس جانے کا راستہ بتانے لگا۔ صعیب نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

گڈس آفس کے اندر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ کئی لوگ وردی میں ملبوس وہاں ٹہل رہے ہیں۔ لوگ سامان لئے آرہے ہیں۔ اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ وہ دل میں کہہ رہا تھا۔ "اب میرا کام ختم ہوا۔ یہاں سے نکل کر چیزیں خریدتا ہوا کیمپ پہنچ جاؤں گا۔"ایک ویران سا گوشہ دیکھ کر وہ اس طرف بڑھا اور وہاں کھڑے ہو کر اس نے کندھے سے سیاہ بکس کو اتار کر رکھ دیا۔ اسے خبر نہ ہوئی کہ گڈس آفس کے کئی محافظوں کی نظریں اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔

صعیب نے بکس کو ایک نظر دیکھا۔ کندھے جھٹکے اور وہاں سے چل پڑا۔ ابھی گڈس آفس کے دروازے کے پاس ہی پہنچا تھا کہ کسی نے اسے پیچھے سے گردن سے پکڑلیا اور کہا "کہاں جارہے ہو؟"

صعیب نے مڑ کر دیکھا۔ ایک وردی والا شخص اس کو گھور رہا تھا۔ اس نے جواب دیا'

"گھر جارہا ہوں"

"یہ بکس وہاں کیوں رکھا ہے؟"

"مجھے کہا گیا تھا کہ یہ بکس میں ریلوے کے گڈس آفس میں رکھ کر چلا آؤں۔" صعیب بے چینی اور گھبراہٹ محسوس کرنے لگا تھا۔اسے وردی والے شخص سے خوف محسوس ہورہا تھا۔

"کس نے کہا تھا؟" وردی والے نے پوچھا۔

"اور اس بکس میں کیا ہے؟"

صعیب کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ چند لمحوں میں وہاں لوگ جمع ہوگئے۔ وہ سب اس سے طرح طرح کے سوال پوچھ رہے تھے۔ اس سے کوئی جواب بن نہ رہا تھا وہ اسے دھکیلتے اور گھسیٹتے ہوئے ایک کمرے میں لے گئے۔ بکس بھی کسی نے وہاں پہنچا دیا۔ سب اسے گھور رہے تھے۔ صعیب نے محسوس کیا کہ وہ

کسی بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔

☆.....☆.....☆

وہ اس سنسان گلی کے اس ویران مکان سے نکلی اور چل دی۔ جب وہ چند گز کا فاصلہ طے کر چکی تو اس نے مڑ کر دیکھا وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ مسکرائی پھر اس نے ایک موڑ کاٹا اور دوسری گلی کے ایک مکان میں داخل ہوگئی۔ مکان میں موجود آدمی اس کو دیکھ کر بے چینی سے اٹھا اور بولا

"کہو کیا خبر لائی ہو؟"

"تیس لبنانی پونڈ میں کام ہوگیا۔ عورت نے جواب دیا۔ اور پھر ایک فلسطینی کو بھی مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔"

"تفصیل سے بتاؤ۔"

وہ بتانے لگی کہ کس طرح اس نے ایک نوجوان فلسطینی کو پھانسا اور اب وہ اس بکس کو اٹھا کر گڈس آفس پہنچ گیا ہوگا۔ اس آدمی نے عورت کو تعریف اور تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری ذہانت نے ہمیں کئی بار بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ یہ بدبخت فلسطینی گوریلے اور دیگر فلسطینی نوجوان اس طرح سے ہی ٹھکانے لگنے چاہئیں۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ فلسطینی لاش کو ایک فلسطینی کا ہی کندھا ملا۔ جب تک ہم یہودیوں میں تم جیسی عورتیں اور مجھ جیسے مرد پیدا ہوتے رہیں گے یہ عرب ہمارے ہاتھوں شکست کھاتے اور ذلیل ہوتے رہیں گے۔ تم جانتی ہو کہ جس فلسطینی کی لاش اس سیاہ بکس میں بند ہے اس نے ہمارے خلاف رائے عامہ کو کس حد تک متاثر کرلیا تھا اور پھر اس نے کسی طرح سے ہماری خفیہ تنظیم کے کچھ راز بھی جان لئے تھے۔ اسے ختم کرنا ضروری تھا۔ اور تم نے یہ کارنامہ بڑی مہارت سے انجام دیا ہے۔ تم مظلوم عرب بن کر اسے اس مکان میں لے آئی تھیں اور پھر ہم نے اس کا کام تمام کردیا۔ اب تم نے ایک دوسرے فلسطینی کو خوب پھانسا۔ کل کے اخباروں میں یہ خبر جلی حروف میں شائع ہوگی کہ ایک فلسطینی نے دوسرے فلسطینی کو قتل کر کے اس کی لاش بکس میں بند کی اور گڈس آفس میں پکڑا گیا۔ وہ دونوں قہقہے لگانے لگے۔ مسرت اور فتح کے قہقہے!

☆.....☆.....☆

سیاہ بکس کھولا جاچکا تھا۔ اس میں سے کٹی ہوئی لاش برآمد ہوئی تھی جس کا چہرہ سلامت تھا اور اس چہرے سے اس لاش کی شناخت کرلی گئی۔ ابوجریر اتنا گمنام نہ تھا کہ لوگ اسے پہچان نہ سکتے۔

ابوجریر کی لاش دیکھ کر صعیب چیخ اٹھا۔ ایک بار یہ شخص کیمپ میں آیا تھا۔ اس نے

فلسطینی مہاجروں کو جمع کر کے تقریر کی تھی۔ ان کو حوصلہ دیا تھا۔ صعیب اس سے بے حد متاثر ہوا تھا اور اب وہ اس کی لاش اٹھائے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا۔ اس کا ذہن گھوم رہا تھا۔ یہ سب کیا ہے؟ اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔

سب لوگوں کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بار بار اپنے بارے میں بتا رہا تھا کہ وہ فلسطینی مہاجر ہے۔ کیمپ میں رہتا ہے۔ اس کی ماں بیمار ہے۔ وہ محنت مزدوری کے لئے نکلا تھا۔ کام نہیں ملا تھا مایوس ہو کر چل پڑا تھا۔ اور پھر اسے ایک گلی میں ایک عورت ملی وہ سب کچھ بتا رہا تھا اور اس نے ستائیس لبنانی پونڈ نکال کر میز پر رکھ دیئے اور بتایا کہ اسے تیس لبنانی پونڈ مزدوری ملی تھی اور تین پونڈ اس نے ٹیکسی والے کو دے دیئے تھے۔

وہ رو رہا تھا۔ کچھ لوگوں کو اس کی کہانی پر یقین آگیا تھا۔ وہ اتنا بھولا' اتنا معصوم اور سادہ نظر آرہا تھا کہ ابو جریر کو قتل نہ کر سکتا تھا۔ اس کے قتل کی کسی سازش میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے آنسوؤں اور معصوم لہجے سے لوگ متاثر ہو رہے تھے۔ چند آدمی اس کی سفارش کر رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے اس کو ساتھ لیا اور پھر اس گلی میں جا نکلے جہاں سے وہ سیاہ بکس اٹھا کر نکلا تھا۔ اس نے لوگوں کو وہ بالکونی دکھائی جہاں عورت کھڑی تھی۔ وہ گھر سنسان پڑا تھا۔

پھر وہ اسے کیمپ میں لے گئے۔ فلسطینی مہاجروں کے کیمپ انچارج نے تصدیق کی کہ صعیب یہیں اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ کچھ اور لوگوں نے بتایا کہ وہ آج ان کے ساتھ مزدوری کرنے نکلا تھا۔ چوک میں گھنٹوں کھڑا رہا تھا کہ کوئی کام مل جائے۔

تفتیش اور تحقیق کرنے والے عملے کو صعیب کی بے گناہی کا یقین ہو گیا تو انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔ اور کہا کہ جب اس کی ضرورت ہوگی وہ اسے بلوالیں گے۔ جب اسے رہائی دی گئی تو کسی نے اس کو روک کر اس کے ہاتھ میں کچھ تھما دیا۔ کسی نے کچھ کہا بھی تھا لیکن وہ اس کا پورا جملہ نہ سن سکا۔ اس کے کانوں میں صرف یہ آواز پڑی کہ "ماں بیمار ہے اس کو یہ دے دو۔"

ماں کی بیماری کے الفاظ سن کر وہ گھبرا گیا۔ خدا نہ کرے کہ کیمپ میں اس کی بوڑھی ماں کو کسی نے اس مصیبت کی اطلاع دے دی ہو۔ وہ تو صدمے سے مرجائے گی۔ وہ تیزی سے باہر نکلا اور دوڑ پڑا۔ دوڑتے ہوئے وہ ایک جگہ گر پڑا۔ تھکن اور پریشانی سے اس کا برا حال ہو چکا تھا۔ بھوک نے نقاہت کو بڑھا دیا تھا۔ وہ زمین پر گرا پڑا رہا ہانپتا رہا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ جب اسے

ہانپتے ہوئے کچھ وقت گزر گیا تو وہ اٹھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی ماں کی شکل آگئی۔ بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کے قدموں کی رفتار پھر تیز ہوگئی۔ وہ کیمپ میں اپنی ماں کے پاس جلد از جلد پہنچنا چاہتا تھا۔ آنسوؤں اور ہچکیوں میں اضافہ ہوگیا۔ وہ "ماں ماں" چیختا ہوا پھر دوڑنے لگا۔

شام ہورہی تھی جب وہ اپنے خیمے تک پہنچا۔ خیمے کے سامنے جاکر اس نے سانس لیا۔ پھر اندر داخل ہوگیا۔ اس نے دیکھا کہ خیمے میں گہری تاریکی ہے۔ ماں نے چراغ نہیں جلایا تھا اور فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ جھکا ماں کو اس کے ہاتھوں نے سہارا دے کر اوپر اٹھایا اور پھر اس کی جان میں جان آگئی' ماں زندہ تھی۔

ماں کو آرام سے لٹا کر اس نے چراغ جلانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس کی مٹھی کھلی اور اس میں سے کچھ زمین پر گر پڑا۔ **صعیب** نے چراغ جلا کر دیکھا۔ فرش پر ستائیس لبنانی پونڈ پڑے تھے۔ اور ماں بھی بے سدھ لیٹی ہوئی تھی۔ چہرے سے بھوک صاف نظر آرہی تھی۔ ماں کو دوائی کی ضرورت تھی۔ خوراک کی ضرورت تھی۔ دودھ کی ضرورت تھی۔

ستائیس لبنانی پونڈ کی رقم اس کی سب ضرورتیں پوری کرسکتی تھی۔ ماں کے لئے دودھ آسکتا تھا۔ دوائی آسکتی تھی۔ وہ خود کئی دنوں کے بعد پیٹ بھر کر کھانا کھاسکتا تھا اور ان پیسوں سے وہ کئی دنوں کے لئے اپنے گھر کی ضروریات پوری کرسکتا تھا۔ یہ رقم اس کی ماں کو موت کے منہ میں جانے سے بچاسکتی تھی۔

صعیب نے ایک نظر ماں کی طرف دیکھا۔ پھر جھک کر اس نے ستائیس پونڈ اٹھائے۔ ان نوٹوں کو چھونے کی دیر تھی کہ اسے یوں لگا جیسے اس نے آگ کو چھولیا ہو۔ اس کا ہاتھ جلنے لگا ہو۔ اس نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور ماں کی طرف دیکھا جس کا سانس اکھڑ رہا تھا۔

"ماں۔ ماں" **صعیب** کا سارا وجود رو اٹھا۔ اس نے ہمت کر کے ایک بار پھر اپنا ہاتھ فرش پر پڑے ہوئے ستائیس لبنانی نوٹوں کی طرف بڑھایا لیکن اس کی انگلیاں ابھی ان نوٹوں کو چھونے بھی نہ پائی تھیں کہ اس نے پھر اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ یہ نوٹ یہودیوں کے دیئے ہوئے ہیں۔

"ہاں' یہ نوٹ اس نے مزدوری کے بدلے حاصل کئے تھے لیکن اس نے مزدوری کیا کی تھی؟ ابو جریر کی لاش اٹھانے کا معاوضہ لیا تھا۔"

"ابو جریر۔ ابو جریر۔" **صعیب** کے دل کی دھڑکنیں پکارنے لگیں۔ "نہیں۔" وہ چیخا پھر بے تاب ہو کر اپنی ماں سے لپٹ گیا۔

وہ آنسو بہاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "ماں!

انمول ستارے

- عقلمند انسان بات سنکر بولتا ہے اور بے وقوف بغیر سنے اور سوچے بولتا ہے۔
- جو بات اچھی سنو اس پر عمل کرو۔
- استاد کا احترام کرنا چاہئے کیونکہ استاد کا درجہ باپ کے برابر ہوتا ہے۔
- عقل کے مقابلے میں طاقت کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔
- جس انسان کے دل میں کوئی خواہش نہیں وہ فرشتہ صفت انسان ہے۔

مرسلہ..... عرفان حسین، کراچی

مجھے تیری موت گوارا ہے۔ لیکن ان یہودیوں کی رقم سے ملنے والی تیری زندگی مجھے گوارا نہیں۔ ماں میں تیرا بیٹا ہوں ..... ماں وطن کی طرح تو بھی شاید مجھے جدائی دے جائے۔ لیکن ماں'..... دشمنوں کی دی ہوئی زندگی نہ اپنے لئے قبول کرتا ہوں۔ نہ تیرے لئے۔ ..... ماں' بھوک سے مرجانا اس زندگی سے کہیں بہتر ہے جو دشمن کی دی ہوئی ہو۔"

صعیب کو یہ باتیں کہہ کر قرار آگیا۔ اس نے اپنا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا اور اپنی ماں کو دیکھا۔ اس کی ماں کے چہرے پر عجیب سا سکون اور نور تھا۔ وہ مرچکی تھی!

ماں کے مردہ چہرے کا سکون اپنے بیٹے سے کہہ رہا تھا۔ "تم نے اچھا کیا مجھے مرجانے دیا۔ اگر تم یہودی کے دیئے ہوئے ان نوٹوں سے میرے لئے کوئی چیز خریدنے جاتے تو میں تمہاری واپسی تک مرچکی ہوتی اور اگر زندہ بھی رہتی تو تم جو کچھ اس رقم سے خرید کر لاتے میں اسے چکھتی تو مرجاتی' موت خدا کی دین ہے زندگی کی طرح' اور موت بھی مقدس ہونی چاہئے' زندگی کی طرح ..... میرے بچے! تم نے اچھا کیا کہ مجھے سکون سے مرنے دیا۔ اور سنو' تم بھی بھوک سے مرجانا' ان نوٹوں کو ہاتھ نہ لگانا۔ اپنی زندگی گزارنا ہی ہمارا شیوہ ہے۔ دوسروں کی دی ہوئی زندگی سے موت بہتر ہوتی ہے۔"

صعیب اپنی ماں کی لاش کے قدموں سے لپٹ گیا اور اب نہ اسے بھوک ستا رہی تھی نہ وہ کسی وجہ سے پریشان تھا اور وہ تھکن بھی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس نے اپنی ماں کی لاش کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ وہ عجیب سی غنودگی میں ڈوبتا جارہا تھا۔ رات گزر گئی۔

دوسرے دن ایک پڑوسی دوپہر کے وقت **صعیب** کی ماں کی خیریت پوچھنے اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ماں بیٹا مرے پڑے ہیں۔ بیٹے کے ہاتھ میں ماں کا ہاتھ تھا اور دونوں کی لاشوں سے کچھ فاصلے پر ستائیس لبنانی پونڈ پڑے تھے۔

قصہ کوئیز 1

محمد سلیم مغل

اپنی سابقہ روایت کی طرح اس بار بھی نئے انداز کا کوئیز پیش ہے۔ حقائق کی تاریخ سے ۵ ایسے واقعات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ جنہیں پڑھ کر فکر کو رعنائی اور سوچ کو مہمیز ملتی ہے۔ ہر واقعے کے نتیجہ میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ گویا پانچ واقعات اور دس سوال۔ آپ کو ان سوالات کے جواب ۱۵ یوم کے اندر اس طرح بھجوانے ہیں کہ "کوپن" ساتھ ضرور آئے۔ یقین کیجئے۔ ہمارے پاس آپ کے لئے ۱۰ قیمتی انعامات ہیں۔ تو پھر اٹھایئے قلم اور سوچ سمجھ کر جواب دیجئے۔ (مرتب)

ایک روز وہ اپنی تجربہ گاہ میں کام کر رہا تھا۔ اس کی نظر ایک ایسے برتن پر پڑی جس کے ایک حصے میں پھپھوند لگی ہوئی تھی۔ اس نے خردبین سے پھپھوند کے ایک ٹکڑے کو غور سے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ جسم میں پیپ (انفیکشن) پیدا کرنے والے بہت سے جراثیم اس پھپھوند کے ٹکڑے سے چپکے ہوئے ہیں اور آہستہ آہستہ مر رہے ہیں۔ پھر اس نے پھپھوندی کا بغور جائزہ لیا اور کئی روز تک اس پر خوب تجربات کئے۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جسم میں زہر پیدا کرنے والے کئی جراثیم پھپھوند سے تیار کردہ مواد سے مرجاتے ہیں جبکہ پھپھوند سے تیار ہونے والی دوا خود جسم پر کوئی مضر اثر نہیں چھوڑتی۔ اس واقعے نے طب کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔

بتایئے تجربہ کرنے والا کون تھا؟ اور یہ کہ اس واقعے کے نتیجے میں کون سی دوا تیار کی گئی؟

ہزاروں، لاکھوں انسانوں کا جم غفیر ہے اور اس اجتماع عظیم کا ہر فرد محبت اور عقیدت سے سرشار ہو کر سحر طاری کر دینے والے خطاب کو سن رہا ہے۔

"لوگو! بے شک تمہارا خدا ایک ہے اور بیشک تمہارا باپ ایک ہے۔ جان لو کہ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں مگر ہاں اس کو فضیلت

ہے جو تقویٰ میں بہتر ہے۔"

" تمہاری جانیں، تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں ایک دوسرے پر قیامت تک کے لئے اس طرح حرام ہیں جس طرح تم آج کے دن اس شہر اور اس مہینے کی حرمت کرتے ہو۔"

بتایئے خطیب کون ہے؟ اور یہ بات کس جگہ پر کہی جارہی ہے؟

اس نے تڑاخ سے ملازم کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ ملازم روہانسا ہو کر ایک طرف چل دیا۔ اس واقعے کا علم جب ماں کو ہوا تو انہیں بے حد دکھ ہوا۔ ماں نے بچے کو بلا کر اپنے دکھ اور احتجاج کا اظہار کیا اور کہا "یاد رکھو جب تک تم نوکر سے معافی نہیں مانگ لیتے میں بھی تمہیں معاف نہیں کروں گی۔" آخر کار بچے کو نوکر سے معافی مانگنی پڑی۔

بتایئے یہ کون بچہ تھا جس کی تربیت اتنی عظیم ماں نے کی؟ اس بچے نے بڑے ہو کر کون سا کارنامہ سر انجام دیا؟

ٹرین تیز رفتاری کے ساتھ سیٹیاں بجاتی جنگل سے گزر رہی تھی اچانک ٹرین کے ایک ڈبے سے دھواں اور پھر آگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ٹرین جنگل میں رک گئی۔ مسافر حیران اور پریشان ہو کر ٹرین سے نیچے اتر آئے۔ ریلوے کے عملے نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ ایک ڈبے میں موجود ایک نوجوان سائنسی تجربے میں مصروف ہے۔ ایسے ہی کسی تجربے کے باعث یہ آگ بھڑک اٹھی تھی۔ آگ پر قابو پالیا گیا لیکن ریلوے گارڈ اپنے غصے پر قابو نہ پاسکا۔ گارڈ نے نوجوان کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا اور اسے ایسا تھپڑ رسید کیا کہ وہ ہمیشہ کے لئے ایک کان سے بہرہ ہو گیا۔

کون بہرہ ہو گیا؟ انسانیت پر اس کے کون سے احسانات ہیں؟

کراچی کے ایم اے جناح روڈ پر واقع خالقدینا ہال میں ایک مشہور مقدمے کی سماعت ہو رہی ہے۔ انگریز منصف ہے اور مسلمان ملزم۔ آزادی کے جذبے سے سرشار اس عظیم مجاہد سے جب گواہی کے لئے پوچھا جاتا ہے؟ تو جواب میں یہ مجاہد ایک تاریخ ساز شعر کہتا ہے۔

ہم کو خود شوق شہادت ہے گواہی کیسی
فیصلہ کر بھی چکو ملزم اقراری کا

یہ شعر کس نے کہا؟ مقدمے کی نوعیت کیا تھی؟

بابائے ملت

مجید لاہوری

سختیاں جھیل کر، جان پر کھیل کر
ہم ہیں اسلاف کی عظمتوں کے امیں
سربلندی کی نعمت ملی ہے ہمیں
دین و دنیا کی دولت ملی ہے ہمیں
اک مقدس امانت ملی ہے ہمیں
یعنی اپنی حکومت ملی ہے ہمیں

ملک و ملت کے ہم سب وفادار ہیں
جس کی بابائے ملت نے رکھی بِنا
ہم اسی قصرِ ملت کے معمار ہیں

اے شہیدو کی روحو! دعا دو ہمیں
اور تم کو خراجِ وفا دیں گے ہم
خطۂ پاک کی آبرو کے لئے
آخری قطرۂ خوں بہا دیں گے ہم
اس مقدس امانت کا کوئی نہیں
ہم سے بہتر امیں، یہ دکھا دیں گے ہم

ہمتیں ہیں جواں، عزم بیدار ہیں
جس کی بابائے ملت نے رکھی بِنا
ہم اسی قصرِ ملت کے معمار ہیں

بچپن کے بارے میں اگرچہ بہت مختصر معلومات سامنے آئی ہیں لیکن ان معلومات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ محمد علی جناح میں بچپن سے ہی مستقبل میں قائداعظم بننے کی علامتیں موجود تھیں۔

قائداعظم کی بہن محترمہ فاطمہ جناح نے جن کو ایک طویل عرصہ تک قائداعظم کے ساتھ رہنے کا موقع ملا اپنے خاندانی ذرائع کے حوالے سے اپنے بڑے بھائی کے بچپن کے کچھ حالات اپنی نامکمل کتاب "مائی برادر" یعنی "میرا بھائی" میں بیان کئے ہیں ---- جن سے پتہ چلتا ہے کہ قائداعظم کے دادا کا نام "پونجا" تھا اور وہ کاٹھیاوار کی ایک ریاست گونڈل کے قریب ایک گاؤں "پنیلی" میں رہتے تھے اور کپڑے کی تجارت کیا کرتے تھے۔ پونجا کے تین بیٹے تھے۔ والجی، ناتھو اور جناح۔ آخرالذکر جناح اپنے بڑے بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ ذہین، تیز و طرار اور مہم جو تھے۔ چنانچہ انہوں نے بڑے ہو کر اپنے والد کا پیشہ اختیار کرنے کے بجائے کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا اور "پنیلی" کو چھوڑ کر گونڈل میں سکونت اختیار کرلی۔ جناح کو قدرت نے ایک تاجر کا ذہن بخشا تھا لہٰذا انہوں نے بہت جلد ترقی کی منزلیں طے کرنا شروع کردیں۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ کراچی آگئے اور یہاں تجارت شروع کردی۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ اسی شہر کے ایک قدیم محلہ کھارادر میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے والد کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ چنانچہ ان کی پرورش ابتداء ہی سے بڑے ناز و نعم کے ساتھ ہوئی۔ ابتدا" گھر پر تعلیم پائی اور بعد میں اسکول جانے لگے۔

محترمہ فاطمہ جناح نے لکھا ہے کہ محمد علی جناح ہمسایوں کے ہم عمر بچوں کے ساتھ بڑی رغبت سے کھیلتے تھے ---- ان بچوں میں وہ ایک اچھے کھلاڑی مانے جاتے تھے۔ یہ بچے انہیں اپنا لیڈر اور قائد سمجھتے تھے اور محمد علی خود بھی فطری طور پر اپنے آپ کو ان بچوں کے درمیان زیادہ برد باد، زیادہ ذہین اور ہوش مند تصور کرتے تھے۔

محمد علی جناحؒ کے اس احساس نے ہی بہت جلد ان کے اندر بڑے آدمیوں کا سا رکھ رکھاؤ پیدا کردیا اور تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے والد کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ ان کی سمجھ میں اب یہ بات بھی آگئی تھی کہ بغیر تعلیم کے نہ کاروبار کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے ترقی دی جاسکتی ہے لہٰذا انہوں نے اپنی تعلیم کو مکمل کرنے کے لئے سخت محنت شروع کردی۔ وہ گھر پر رات کو دیر تک پڑھا کرتے اور اس ارادہ کے ساتھ کہ ان کو نہ صرف اپنے ساتھیوں

قائد کا بچپن

خواجہ رضی حیدر

بچپن انسان کی زندگی کا سب سے سہانا دور ہوتا ہے۔ ایسا دور جس میں خوشیاں اور راحتیں ہوتی ہیں۔ ایسی خوشیاں اور راحتیں جن کو انسان بعد میں ہمیشہ یاد کرتا رہتا ہے۔ مگر بچپن جہاں ایک طرف بے فکری کا زمانہ ہوتا ہے۔ وہاں دوسری طرف اسی بچپن پر آنے والے دنوں کا انحصار ہوتا ہے۔ بچپن میں ہی کسی بچے کی صلاحیتوں کا اس کی فطرت سے تعین کرلیا جاتا ہے۔ اور پھر ان صلاحیتوں کو اس طرح پروان چڑھایا جاتا ہے کہ بچہ اپنی فطرت کے مطابق اپنے مستقبل کو استوار کرسکے ۔۔۔۔۔ اگر آپ اہم اور نامور شخصیات کی زندگی اور ان کے بچپن کا مطالعہ کریں تو ان کے یہاں ایسے امکانات ملیں گے جو ان کے مستقبل کی نشاندہی کرتے ہوں گے۔

بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کے

> مسکراہٹ وہ تجارت ہے جس میں کوئی سرمایہ نہیں لگتا جس میں نفع ہی نفع ہے۔ لینے والوں کے لئے بھی دینے والوں کے لئے بھی مسکراہٹ ہر وقت نہیں رہتی لیکن اس کی یاد سالہا سال رہتی ہے۔ ہر تھکے ہوئے کے لئے طاقت، ہمت ہارنے والوں کے لئے امید کی کرن اور مصیبت زدہ کے لئے تریاق ہے۔

سے آگے بڑھنا ہے بلکہ مستقبل میں ایک بڑا آدمی بھی بننا ہے۔ محمد علی جناحؒ کی والدہ اپنے بیٹے کو اتنی سنجیدگی کے ساتھ تعلیم میں منہمک دیکھ کر اکثر اپنے شوہر سے کہا کرتی تھیں۔ ”تم دیکھ لینا میرا محمد علی بڑا کامیاب آدمی بنے گا۔ اور سب لوگ اس پر رشک کریں گے۔“

محمد علی جناحؒ اپنے والدین کی فرمانبرداری کرتے تھے اور بہن بھائیوں کا بہت خیال کرتے تھے۔ دوسروں کی عزت کرنا ان کی عادت تھی۔

محمد علی جناحؒ کو بچپن میں گولیاں کھیلنے کا شوق تھا لیکن یہ شوق جلد ختم ہوگیا اور وہ کرکٹ کھیلنے لگے۔ پھر جب وہ ذرا بڑے اور سمجھ دار ہوگئے تو گھڑسواری میں دلچسپی لینے لگے۔ ان کے والد کے پاس کئی گھوڑا گاڑیاں تھیں جو ان دنوں شاہانہ سواری سمجھی جاتی تھی کیونکہ موٹر کاروں کو اس وقت کوئی رواج حاصل نہیں ہوا تھا۔ محمد علی جناحؒ نے بہت جلد گھڑسواری سیکھ لی اور شام کو وہ روزانہ ایک دوست کے ساتھ دور تک اور دیر تک گھڑسواری کرتے تھے۔ بقول محترمہ فاطمہ جناح ”وہ دن کو اسکول جاتے، دوپہر کو اسکول کا کام کرتے، شام کو گھڑسواری کرتے اور رات کو مطالعہ کرتے رہتے تھے۔“

قائداعظم کے اندر اپنی عمر کے ساتھ ہی ساتھ لکھنے پڑھنے کا رجحان تیزی سے پروان چڑھ رہا تھا۔ وہ روز بروز سنجیدہ ہوتے جارہے تھے اور ان کے اندر یہ خیال تقویت پارہا تھا کہ ان کو علم حاصل کر کے ایک بڑا آدمی بننا ہے۔ اسی خیال کے زیر اثر ان کی قوت فیصلہ میں اضافہ ہوتا رہا وہ بہت جلد فیصلہ کرنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے فیصلہ پر قائم بھی رہتے تھے کیونکہ ان کو یقین ہوتا تھا کہ انہوں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ درست اور حق و انصاف پر مبنی ہے۔ فیصلہ کرنے کی یہ قوت بعد میں ان کی شخصیت کا حصہ بن گئی۔ نفاست پسندی، جرأت، بے باکی، علم دوستی، صاف گوئی، ہمت و استقلال یہ تمام خوبیاں قائداعظم میں بچپن ہی سے موجود تھیں اور انہی خوبیوں کی بناء پر اپنی عملی زندگی میں نہ صرف قائداعظم کے مرتبہ پر فائز ہوئے بلکہ اسلامیان ہند کے لئے انہوں نے ایک علیحدہ وطن پاکستان حاصل کیا۔

قائداعظم زندہ باد ۔۔۔۔ پاکستان زندہ باد ●●

کتے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

جدید عہد کا تاشقند۔ پھلوں کی تجارت بھی، شاندار عمارت بھی

دوسری صدی کا یادگار نمونۂ آرٹ

تاشقند کے بازار میں گرما گرم چھولے

ی زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں، میں اسی لئے نمازی

انگلیوں پر نچانا صرف محاورہ ہی نہیں، فن بھی ہے
تاشقند کے ایک فن کار کا انوکھا انداز۔

وسط ایشیا کی اہم ترین اسلامی مملکت ازبکستان کا باوقار دارالحکومت "تاشقند" سمرقند سے 250 کلو میٹر کے فاصلہ پر دریائے آمو کے دائیں جانب بہتی ایک ندی کے کنارے واقع ہے۔ اس کی آبادی تقریباً 27 لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ بہ لحاظ آبادی تاشقند ازبکستان کے 123 شہروں میں سب سے بڑا ہے۔ جبکہ ماضی میں یہ سابقہ سوویت یونین (روس) کا ماسکو، لینن گراڈ اور حیف کے بعد چوتھا بڑا شہر کہلاتا تھا۔ اس وقت یہاں ازبک مسلمانوں کا تناسب 88 فیصد ہے اور بقیہ 12 فیصد لوگ مختلف روسی اقوام سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن میں روسی قوم "سلاف" کو اکثریت حاصل ہے۔ آبادی کا 69 فیصد حصہ دیہات میں رہتا ہے۔ جبکہ صرف 31 فیصد لوگ شہر میں رہائش پذیر ہیں۔ ازبک یہاں کی سرکاری زبان ہے۔ جو ترکی زبان سے خاصی ملتی جلتی ہے۔ اور کاشغر سے لے کر باکو (آذر بائیجان) بلکہ استنبول تک ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں فارسی، ترکی، عربی، روسی اور اردو زبانیں جاننے والوں کی تعداد بھی کافی ہے۔

ازبک دنیا کی ایک بہادر اور جفاکش قوم ہے۔ یہ لوگ اسلام سے دل کی گہرائیوں کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ اس جذبے کی عکاسی ان کی تہذیب و ثقافت میں نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اپنے ملک کے بعد ان کے دل میں جن اسلامی ممالک کا بہت احترام ہے وہ سعودی عرب اور پاکستان ہیں۔

ازبکوں کا شہر تاشقند اپنی تاریخ کے لحاظ سے دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ اس وقت اس کی عمر تقریباً 3000 سال ہے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کے مطابق جس جگہ آج تاشقند آباد ہے وہاں سینکڑوں سال پہلے ایک بہت قدیم شہر آباد ہوا کرتا تھا جسے 300 قبل مسیح میں یونانی فاتح سکندر اعظم نے تسخیر کیا تھا۔ یونانی اور رومی مورخین نے اس شہر کا نام "یونی" لکھا ہے۔ بعض چینی کتابوں میں اس کو چوچی، چوشی اور شی کہا گیا ہے۔ جس کے معنی پتھر کے ہیں۔ اس کے علاوہ بن قند، بچ قند اور جاج بھی اس کے قدیم نام ہیں۔

آٹھویں صدی عیسوی میں اس علاقہ کے حکمران ملک شاش نے اس کا نام تبدیل کر کے شاش رکھا تھا۔ 751ء میں ایک چینی گورنر کاؤس این جی نے ملک شاش کو قتل کردیا تھا۔ یوں یہ شہر چینی بادشاہت کا حصہ بن گیا شاش کے بیٹے نے عرب مسلمانوں سے مدد کی درخواست کی..... خراسان (ایران) کے گورنر ابو مسلم خراسانی نے زیاد بن صالح کو آل شاش کی مدد کے لئے بھیجا

جس نے دریائے تلاس کے کنارے چینیوں کو عبرت ناک شکست دے کر پورے وسط ایشیا میں اسلام اور مسلمانوں کی دھاک بٹھا دی۔ 806 میں غیر مسلم ترکوں نے شاش پر قبضہ کرلیا اور اس کا نیا نام "تاش کند" رکھا..... ترکی زبان میں اس کی معنی ہیں پتھروں کا شہر۔

اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اہل شہر نے دشمنوں کی یلغار سے بچنے کے لئے شہر کے اردگرد بھاری پتھروں کی ایک انتہائی مضبوط فصیل تعمیر کر رکھی تھی ..... ترکوں نے اسی فصیل کی تعمیری ساخت سے متاثر ہو کر اس شہر کو "تاش کند" کا نام دیا..... جو بعد میں تاشقند مشہور ہوا۔

1917ء کے انقلاب روس کے بعد جب ازبکستان سوویت یونین (روس) کا باضابطہ حصہ بنا تو روسی کمیونسٹوں نے ازبک مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کردیا۔ لاکھوں بے گناہ اور نہتے مسلمان شہریوں کو سفاکی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا..... لاکھوں انسانوں کو سائبیریا کے یخ بستہ برفستانوں اور قازقستان کے تپتے صحراؤں میں دھکیل دیا گیا..... جہاں وہ سخت سردی اور جھلسا دینے والی تپش کا مقابلہ کرتے ہوئے زندگی ہار بیٹھے..... علماء دین کو قتل کرنے کے بعد ان کی نعشوں کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر کے سمندر میں مچھلیوں کے آگے ڈالا گیا..... دینی درس گاہیں بند کردی گئیں..... مسجدوں کو اصطبل میں تبدیل کردیا گیا..... اسلامی شعائر اور مذہب کی نشر و اشاعت پر سخت ترین پابندیاں عائد کردی گئیں

ظلم و تشدد حد سے بڑھ چکا تھا ان حالات میں آزادی کی تحریکوں کا وجود میں آنا یقینی تھا۔ ازبکوں کے سرکردہ افراد نے غلامی سے نجات حاصل کرنے کا عمل تیز سے تیز کردیا۔ اسی دوران 1930ء میں تاشقند کو ازبکستان سوویت اشتراکی جمہوریہ کے نئے دارالحکومت کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس سے قبل یہ اہمیت 1925ء سے سمرقند کو حاصل تھی۔ روسی لیڈروں نے آزادی کی تحریکوں کا زور توڑنے کی تمام ناجائز کوششیں کیں لیکن باطل، حق کا سر نہ جھکا سکا اور 1991ء میں بیسویں صدی کا وہ عظیم الشان انقلاب رونما ہوا جس نے روس جیسی سپر پاور اور وسیع و عریض مملکت کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ اس انقلاب کے نتیجے میں جو مسلم ریاستیں وجود میں آئیں ان میں ایک ازبکستان بھی تھا!!

اور پھر 70 سال کے بعد تاشقند، ازبکستان کی پر عظمت مسجدیں اذان کی پر تاثیر صداؤں سے گونجنے لگیں..... جو اس بات کا اعلان تھا کہ ظلم کا اندھیرا مٹ گیا ہے اور امن و سلامتی کے دین کو فتح حاصل ہو چکی ہے!!

آزادی حاصل ہونے کے فوراً بعد سے

جفاکش ازبک اپنے ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے نئے جوش اور ولولے کے ساتھ دن رات مصروف عمل ہیں۔

تاشقند کو تعلیم کے شعبے میں قابل تقلید ترقی کی منزلوں تک پہنچا دیا گیا ہے۔ یہاں شرح خواندگی کا تناسب 96 فیصد ہے۔ شہر بھر میں متعدد اسکول اور دینی درس گاہیں قائم کی گئی ہیں۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں کی تعداد 19 ہے۔ جن میں تقریباً ایک لاکھ طلباء زیر تعلیم ہیں۔ ازبکستان کا سب سے بڑا سائنسی تعلیم کا ادارہ "اکیڈمی آف سائنسز" بھی اسی شہر میں ہے۔ جن کے تحت درجنوں تحقیقی ادارے کام کر رہے ہیں۔ 1920ء میں قائم ہونے والی "تاشقند یونیورسٹی" کو وسط ایشیا کی سب سے پرانی اور ازبکستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس دانش گاہ میں اردو زبان کا شعبہ بھی موجود ہے۔ جس کے طلباء کو آپ روانی سے اردو بولتے دیکھیں گے۔ زرعی یونیورسٹی میں طلباء کو زراعت کی جدید ترین تعلیم و تربیت فراہم کی جاتی ہے۔ فوجی اکیڈمی تاشقند عالمی معیار کی عسکری تربیت گاہ ہے۔ ازبکستان کے دیگر شہروں کے علاوہ چار ایشیائی ممالک کے کیڈٹس بھی یہاں فوجی تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں۔ قدیم دینی درس گاہوں میں "مدرسہ کوکلتاش" (جس کا ذکر غلطی سے بخارا کے مضمون میں کر دیا گیا تھا) کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

مطالعے کے شائقین کے لئے شہر میں جگہ جگہ کتب خانے قائم کئے گئے ہیں۔ ان میں مختلف علوم پر ہزاروں نہیں لاکھوں کتابیں، رسائل، جرائد، اور حوالہ جاتی نسخہ جات موجود ہیں۔ "سینٹرل پبلشنگ ہاؤس" وسط ایشیا کا سب سے بڑا اشاعتی ادارہ ہے۔ جس کے زیر اہتمام سو سے زائد اخبارات، ہفت روزے اور ماہنامے شائع ہوتے ہیں۔

تاشقند میں عوام کو تفریحی سہولتیں فراہم کرنے کی غرض سے ہر علاقے میں صاف ستھرے اور کشادہ پارک بنائے گئے ہیں۔ "تاشقند پارک" یہاں کی خوبصورت اور وسیع و عریض تفریح گاہ ہے۔ "حمزہ تھیٹر" سب سے پرانا اور "علی شیر نوائی تھیٹر" اپنی دلکشی اور جدت بھری تعمیر کے لحاظ سے عالمگیر شہرت کا حامل ہے۔

کشتی، شمشیر زنی، باسکٹ بال، گھڑ سواری اور شطرنج باذوق ازبکوں کے پسندیدہ کھیل ہیں۔

ازبکوں کا ایک طبقہ "بخشی لوگ" کہلاتا ہے۔ یہ لوگ محفلوں میں نہایت ترنم بھرے انداز میں لوک داستانیں سناتے ہیں۔ یہ بخشی لوگوں کے پرخلوص اور قابل ستائش کوششوں کا ثمر ہے کہ ازبکوں کی نئی نسل اپنے اسلاف کے

ولولہ انگیز کارناموں اور ناقابل فراموش ماضی سے روشناس ہونے لگی ہے۔

شہر کے اطراف میں پھیلا پہاڑی علاقہ معدنی دولت سے مالا مال ہے۔ سونا' چاندی' تانبا' لوہا' گندھک' کوئلہ' فاسفورس' چونے کا پتھر' قدرتی گیس اور تیل کے ذخائر کی دریافت سے تاشقند کے توسط سے ازبکستان معاشی لحاظ سے کافی مستحکم ہوچکا ہے۔ اور آج اس کا شمار دنیا کے اہم معدنی ممالک میں ہوتا ہے۔

تاشقند کو ازبکستان کا سب سے بڑا صنعتی مرکز ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ "تیان شان" کے پہاڑی سلسلے کے دامن میں "بستان لبق" کے نام سے باقاعدہ ایک صنعتی شہر بسایا گیا ہے۔ جس میں قائم کردہ صنعتی یونٹس میں اونی و ریشمی کپڑا' سیمنٹ' دیا سلائی' کیمیکلز' کھاد' لوہے کی ہلکی اور بھاری مصنوعات اور دیگر بے شمار اشیاء تیار کی جاتی ہیں۔

گھریلو صنعتوں میں لوگ سونے اور چاندی کے پر کشش زیورات' تانبے کے دیدہ زیب منقش برتن' صراحیاں' ٹی سیٹ' جوتے' عالمی شہرت یافتہ قراقلی ٹوپیاں اور ازبکستان کے مشہور زمانہ خنجر بناتے ہیں۔

تاشقند میں مواصلات کا جدید نظام قائم کیا گیا ہے۔ بڑی بڑی کشادہ اور سبک خرام شاہراؤں کو خوبصورت درختوں کی دو طرفہ قطاروں نے خاصا جاذب نظر بنادیا ہے۔ اہم شاہراؤں کے کنارے کھڑی فلک بوس عمارتوں میں وزارتوں اور سرکاری محکموں کے دفاتر بنائے گئے ہیں۔ جدید اور برق رفتار "میٹرو" یہاں کی سب سے مقبول اور سستی سواری ہے۔ عام آدمی بھی معمولی سے اخراجات پر یہ سفری ذریعہ استعمال کرسکتا ہے۔ زیر زمین دوڑنے والی میٹرو کے تمام اسٹیشن ایئر کنڈیشنڈ ہیں۔ اور بڑا اسٹیشن ازبکستان کے قومی شاعر "علی شیر نوائی" کے نام سے موسوم ہے۔ علی شیر نوائی کو ازبک ادب میں وہی مقام حاصل ہے۔ جو حیثیت برصغیر پاک و ہند میں علامہ محمد اقبال کی ہے۔ روسی غلبے کے خاتمے کے بعد قدر دان ازبک قوم اپنے اس عظیم محسن کی خدمات کے اعتراف میں' ملک کے ہر شہر میں ان کے نام سے منسوب کئی عالی شان اور باوقار یادگاریں تعمیر کرچکی ہے۔ جبکہ بہت سی تعمیر کے آخری مراحل میں ہیں۔

"تاشقند انٹرنیشنل ایئرپورٹ" ازبکستان کا مصروف ترین ہوائی اڈہ ہے۔ ازبکستان ایئرویز یہاں سے ملک کے 16 مقامات اور وسط ایشیا کے 42 شہروں تک پروازیں چلاتی ہے۔ ان کے علاوہ دنیا کے 21 بڑے شہروں کے لئے بھی یہاں سے ہوائی جہاز روانہ ہوتے ہیں۔ حال ہی میں اسلام

آباد (پاکستان) کا تاشقند سے فضائی رابطہ قائم ہوا ہے۔ اب اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ سے ہفتے میں دو پروازیں ازبکستان کے دارالحکومت روانہ ہوتی ہیں۔ سفر کا دورانیہ 2 گھنٹے 50 منٹ ہے لیکن براہ راست واخان (افغانستان) پر سے پرواز کی اجازت مل جانے کے بعد یہ سفر صرف ڈیڑھ گھنٹے کا رہ جائے گا۔

ٹیلی وژن ٹاور تاشقند کی جدید عمارتوں میں سے ایک ہے۔ اس کی آٹھویں منزل پر ایک انتہائی جدید انداز کا گھومنے والا ریسٹورنٹ بنایا گیا ہے۔ یہاں سے آپ پورے شہر کا دلفریب اور ناقابل فراموش نظارہ کرسکتے ہیں۔ تاشقند کے قدیم حصہ میں واقع دو شاہراہوں کے سنگم پر 24 منزلہ فلک بوس ہوٹل "چہار سو" فخر سے سر اٹھائے کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ آزادی سے قبل اس کا نام "ہوٹل ماسکو" تھا۔ ازبکوں نے دوسری شاہراہوں اور جگہوں کی طرح اس کا نام بھی تبدیل کردیا ہے۔ اس شہر میں وہ تاریخی عمارت بھی موجود ہے۔ جس میں 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد روسی وزیراعظم کوسیجن کی کوششوں سے صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان اور بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری نے 10 جنوری 1966ء کو "معاہدہ تاشقند" پر دستخط کئے تھے۔ اور پھر اسی رات اس عمارت میں معاہدے کی کامیابی کی خوشی میں ہندو وزیراعظم کا ہارٹ فیل ہوگیا تھا!

تاشقند کی پر عظمت مسجدیں دو دو سو سال پرانی ہیں۔ اسلام سے پہلے بے پناہ محبت کرنے والے ازبکوں نے مختصر عرصے میں شہر میں 18 نئی عبادت گاہیں تعمیر کردی ہیں۔ جن میں اب نمازی خاصی بڑی تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔کوچہ مرزا غالب میں جامع مزار غالب تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ ایک ہزار نمازیوں کی گنجائش والی اس عظیم الشان مسجد میں ایک مدرسہ بھی تعمیر کیا جارہا ہے۔ جس میں تقریباً 300 طلباء کے قیام و طعام کا انتظام بھی ہوگا۔ اسی طرح محلہ البیرونی میں بھی ایک نئی مسجد (جامع البیرونی) کی تعمیر بھی مکمل ہوا چاہتی ہے۔ "جامع مسجد ٹیلہ" تاشقند کی سب سے بڑی عبادت گاہ ہے جس میں ایک لائبریری بھی قائم کی گئی ہے۔

بنفشی پہاڑوں، برفیلی چوٹیوں، سنہری چمکیلے ریگستانوں، بلند و بالا آبشاروں، سدا بہار ہرے بھرے نخلستانوں، بل کھاتی پہاڑی گزرگاہوں، صاف اور شفاف دریاؤں، کشادہ اور مصروف شاہراؤں برق رفتار میٹرو، فلک بوس جدید عمارتوں اور دل موہ لینے والے قدرتی مناظر نے تاشقند کو دلکشی کا کتنا حسین مرقع بنادیا ہے؟؟؟ یہ ہم کیوں بتائیں! آپ خود جاکر دیکھیئے ●

مری سرزمیں پہ کبھی اب نہ آنا

محمد علی انصاری

اگر حافظہ کچھ نہیں ہے پرانا
تو مشکل بہت ہے تمہارا بھلانا
ہماری شجاعت کا دل کش فسانہ
ہمیں جو کہ آتا ہے ہر دم سنانا
مری سر زمیں پہ کبھی اب نہ آنا

نہیں یاد تم کو شکستِ ستمبر؟
کیا تھا وہ دھوکے سے حملہ جو ہم پر
مگر ہم نے ثابت کیا تھا یہ تم پر
کہ آساں نہیں ہم پہ قبضہ جمانا
مری سر زمیں پہ کبھی اب نہ آنا

رہے گی ہمیں یاد ہر ایک ساعت
سب اہل وطن کا وہ شوق شہادت
کہ جذبوں میں شامل تھی ایسی صداقت
نشاں جس کے ممکن نہیں ہے مٹانا
مری سر زمیں پہ کبھی اب نہ آنا

ہیں فوجی جواں عزم و جرأت کے پیکر
لڑیں جو دلوں میں یہ جذبات لے کر
بچانا ہے اس ملک کو جان دے کر
شہادت کا رتبہ ہے بس اب تو پانا
مری سر زمیں پہ کبھی اب نہ آنا

وطن کے جواں اس گھڑی تھے غضنفر
جو ٹوٹے تھے قہر خدا بن کے تم پر
شہیدوں کے تھا خون کا قرض ان پر
ہمیں بھی یہ ہے قرض اک دن چکانا
مری سر زمیں پہ کبھی اب نہ آنا

ہے کچھ یاد؟ ہم نے سبق جو سکھایا
بتائے گی دنیا جو تم نے بھلایا
وہ حلیہ تمہارا تھا ہم نے بنایا
کہ ہنستا ہے تم پر ابھی تک زمانہ
مری سر زمیں پہ کبھی اب نہ آنا

نہ دھوکے سے اب تم کبھی حملہ کرنا
کہیں پھر سے پڑجائیں آہیں نہ بھرنا
برا ہے بہت اپنے ہاتھوں ہی مرنا
نہ قوت ہماری کبھی آزمانا
مری سر زمیں پہ کبھی اب نہ آنا

جنگلی حیات کا دارومدار درختوں پر ہے ۔ درختوں کی حفاظت کیجئے ۔ درختوں سے پیار کیجئے

شکار کا بخار

شازیہ بخاری

ہم چاروں دوست تھے ...... چار ساتھی۔ ہماری دوستی بہت پرانی تھی۔ اتفاقات زمانہ سے کچھ عرصہ پہلے ہم چاروں پیرو کے ساحل پر ایک چینی کارخانے میں اکٹھے کام کرتے تھے۔ ہم مزدور آدمی تھے ڈیوٹیاں بدلتی رہتی تھیں۔ شام کو چھٹی کے بعد اکٹھے خوش گپیاں کرتے تھے۔ وقت گزاری کے لئے کیرم بورڈ کھیلتے اور تاش کھیلتے تھے۔ غریب آدمی تھے اس لئے ہمارا مشغلہ یہی تھا۔ آپس میں لڑتے۔ آپس میں لڑائی جھگڑے کے لئے کوئی نہ کوئی موضوع مل جاتا اور کچھ نہیں تو بال کی کھال نکالنے کے لئے ملکی و قومی موضوعات آسانی سے چھڑ جاتے۔ بعض اوقات تو تو میں میں ہو جاتی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگلی شام نہ ملیں گے۔ ہم ملتے تھے اور بالکل ٹھیک ہوتے۔ کیا مجال کہ دوستی پر آنچ آئے۔ ہم لڑائی کے بعد ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے تو سارا اختلاف دھرے کا

دھرا رہ جاتا۔ سر سبز و شاداب وادیوں میں جاتے اور بسا اوقات ہم قہقہے لگاتے اور کہا کرتے لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔ یا ساحلی علاقوں میں جاتے وہاں چھوٹے موٹے پرندوں کا شکار کرتے۔

ہم شکاری و کاری تو خیر کیا تھے لیکن ہمیں شوق بہت تھا اور یہ بھی ہمارے بارے میں کہا جاتا کہ ہمارا نشانہ کمال کا تھا۔ کبھی خطا نہ جاتا۔

اسی سال ہم چاروں دوست دریائے میرانن کے کنارے واقع ایک گاؤں پہنچے۔ یہاں ہم نے قدرے آرام کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ جس علاقے میں ہم داخل ہوئے وہاں جنگل ہی جنگل تھا۔ جھاڑیاں تھیں اور پگڈنڈیوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہاں پہلے کوئی انسان نہ آیا ہو اور ہم پہلے چار تھے جو یہاں آئے۔ دریا کے کنارے چلتے چلتے ہم جنگل کے دہانے پہنچے۔ جہاں ہم جنگل میں سوروں کا شکار کھیلنے آئے تھے۔

اس سے پہلے ہم نے کبھی سوروں کا شکار نہ کیا تھا۔ سن رکھا تھا کہ سور سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں کسی خاص علاقے پر قابض ہو کر چراگاہوں کو منظم طریقے پر ایک لشکر کی طرح روند ڈالتے۔ یہ بھی سنا تھا کہ اگر یہ تعداد میں دو چار ہوں تو انہیں مارنا بہت آسان ہے اور اگر یہ اکٹھے اور زیادہ ہوں تو انہیں مارنا خود کو ہلاک کرنے کے مترادف ہے۔ جب یہ صف بہ صف چلتے تو بڑے کینہ پرور ہوتے ہیں۔ ہم نے اپنی مہم جوئی اور شکار کے شوق میں اس جنگل میں ذرا آگے پڑاؤ ڈال دیا۔ ہمارے ساتھ کھانے پینے کا وافر سامان اور تین قابل اعتماد ریڈ انڈین اور تیر انداز تھے جن کو تیراکی اور کشتی رانی آتی تھی۔

ایک صبح کا ذکر ہے کہ ہمیں کچھ جھونپڑیاں نظر آئیں ہم نے وہاں قیام کیا اور دوسرے دن جنگل میں داخل ہوئے۔ اور اپنے کیمپ کی مناسب جگہ دیکھ کر واپس آ گئے۔ اپنی کشتی ہم نے قریب ہی باندھ دی۔ سامان اٹھایا اور اس جگہ پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا۔ ہم نے اپنی واپسی اور فرار کے خیال سے کچھ نشان بنائے تاکہ اگر سور ہمارا تعاقب کریں تو ہمیں فرار ہونے میں آسانی ہو۔ ہم نے ریڈ انڈینوں کو جھونپڑیوں ہی میں رہنے دیا اور کہا کہ ضرورت پڑے گی تو سیٹی بجا دیں گے۔ فیصلہ ہوا کہ صبح اٹھتے ہی شکار پر چلیں گے۔

رات کا اندھیرا چھا گیا۔ غضب کی گرمی تھی۔ لیکن ہمیں ڈر لگ رہا تھا۔ اس لئے احساس تحفظ کے لئے آگ بھی جلا رکھی تھی۔ تاکہ ہمیں ایک دوسرے کے چہرے نظر آئیں ہم نے بڑی دیر تک باتیں کیں۔ تمباکو نوشی کی اور پھر جمائیاں شروع ہوئیں اور انگڑائیوں نے زور مارا اور پھر تھکن کے اعترافات ہونے لگے۔ اب اوپر چل کر سونا چاہئے۔ ہم جالی دار جھولوں میں چڑھ گئے جو درخت میں لٹکا لئے تھے لیکن ان کی رسیاں پاس والے دوسرے درختوں میں بھی مضبوطی سے باندھ

دی تھیں۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس اپنی اپنی رائفل، کارتوس اور کھانے پینے کا وافر سامان موجود تھا۔ ہم نے اپنا سامان اٹھایا اور جھولوں پر چڑھ گئے تو بلاوجہ خوف کی ایک مشترک لہر ہم سب کے اعصاب پر طاری ہو گئی اور مارے خوف کے ہنسی نکل گئی اور ہم قہقہے لگانے لگے ... ہم ہنستے چلے گئے یہاں تک کہ ہمارے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ کھانسی آنے لگی۔ ہنسی رکی تو محسوس ہوا کہ ہم تھک گئے ہیں ویسی شدید تھکن جو ایک سپاہی کو مجبور کرتی ہے کہ خطرے کو بالائے طاق رکھ کر گھوڑے بیچ کر سو جائے۔ ہماری اندرونی کیفیت بھی کچھ ایسی تھی کہ ہم اس ------ گرم تنہا جنگل کی رات کے قدرتی جاہ و جلال کو بھی محسوس نہ کر سکے۔

اگلی صبح میری آنکھ جب کھلی تو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا سبب پو پھٹنے کی شاندار چکاچوندھی یا جنگل میں پیدا ہونے والی اجتماعی آواز تھی۔ میں اپنے جھولے میں اٹھ بیٹھا اور احتیاط سے ارد گرد کے ماحول پر نظر ڈالی مگر کچھ بھی دکھائی نہ دیا سوائے زندگی کے بیدار ہونے کے جو رات کی غنودگی کی لپیٹ میں آکر خود بھی سو گئی تھی۔ میں نے اپنے سوئے ہوئے ساتھیوں کو آواز دی وہ بھی اٹھ بیٹھے۔ ہم نیچے اترنے لگے کہ ہمیں شاخوں کے سرسرانے اور پتوں کے کھڑکھڑانے کی آواز سنائی دی پھر دفعتاً یہ آواز رک گئی تو ہم آہستہ آہستہ چپکے چپکے نیچے اترے اور تھرموس کے پانی سے ہاتھ منہ دھوئے، ناشتہ کیا اور بھوکوں کی طرح پیٹ بھرا۔ گیارہ بج گئے تو ہم نے خود کو مسلح کیا اپنی بہادری کو جمع کیا اور جنگل کے اندر گھسنے کی تیاری کرنے لگے کہ پھر وہی آواز سنائی دی اور آہستہ آہستہ قریب آتی گئی ہم نے اپنا ارادہ ترک کیا اور واپس اپنے جھولوں میں آگئے۔ اب ہم آنے والے خطرے کے لئے تیار تھے۔ ہمیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ چاروں طرف کالے سیاہ پھرتیلے سور تیزی سے دوڑتے نظر آئے۔ ہم نے خوشی کے نعروں اور ٹھیک ٹھاک نشانوں سے ان کا استقبال کیا۔ ان میں سے بعض تو وہیں ڈھیر ہو گئے اور بعض زخمی ہونے کے بعد بھاگ گئے اور ان کی جگہ جنگل سے دوسرا گلہ آگیا۔ اتفاق سے چاروں کی پٹیاں بیک وقت خالی ہوئیں رائفل دوبارہ بھرنے کے لئے ہم رک گئے ہم چاروں انسان محفوظ تھے اور جانور غیر محفوظ ..... ہمیں یہ برتری حاصل تھی اس لئے ہم ہنس ہنس کر گولیاں چلا رہے تھے۔

سور گولیاں کھا کر گرتے اور ہم گنتی کرتے جاتے تھے۔ ہلاک شدگان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور زخمیوں کی ان سے بھی زیادہ لیکن جنگلوں کی طرف سے آنے والے تازہ لشکر کی تعداد ان سے کئی گنا زیادہ تھی۔ بھاگنے یا شکست تسلیم کرنے کے بجائے وہ بھرپور جنگ پر آمادہ نظر آتے تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی لاشوں کو سونگھنے کے بجائے آگے بڑھ رہے تھے ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ہماری

رائفلوں کی نالیاں جلدی جلدی گرم ہو جاتیں اس لئے ہمیں فائرنگ روکنی پڑتی ان کے ٹھنڈا ہونے کے وقفے میں ہم سگریٹ پیتے اور اپنی فتح کا جشن مناتے۔ سوروں کے خاموش غصے اور خود اعتمادی پر ہمیں تعجب ہو رہا تھا۔ ہم اس کے بعد بھی تاک تاک کر گولیاں مارتے اور سور مرتے جاتے۔ گھمسان کی یہ جنگ کئی گھنٹوں تک مسلسل جاری رہی۔ شام کو چار بجے ہمیں احساس ہوا کہ ہم خطرے میں ہیں کیونکہ اسلحہ ختم ہو رہا تھا اسلحہ تو کافی تھا لیکن بوچھاڑ بھی ہم نے اندازے سے زیادہ کی۔ جوش میں جہاں نہ مارنا تھا وہاں بھی مارا۔ جہاں ایک گولی کی ضرورت تھی، وہاں دو تین خالی کیں۔ ہم نے معرکہ حسب توقع کامیابی سے طے کیا اور دشمنوں کے گشتوں کے پشتے لگا دیئے تھے ان کی تعداد کافی گھٹا دی تھی لیکن یہ ہماری خوش فہمی تھی جتنے مارے تھے اس سے کہیں زیادہ تعداد میں لشکر کے لشکر، صف بہ صف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے شام کے وقت انکا ایک لشکر جرار اس درخت کے چاروں طرف چیونٹیوں کی طرح جمع ہو گیا جس کی ٹہنیوں پر ہم جھولوں میں بندھے ہوئے تھے گویا اب ہم محاصرے میں تھے۔ وہ اس درخت کی جڑ پر مشتعل ہو کر اپنی تھوتھنیاں مارتے تھے درخت کی چھال پر ان کے تیز نوکیلے دانتوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ ہم زیادہ خوف زدہ نہیں تھے۔

ہمیں معلوم تھا کہ ہم محفوظ ہیں اور یہ ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے ہم ان کے ہجوم کو دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ ان کا محاصرہ سخت سے سخت اور تنگ سے تنگ ہو رہا تھا۔ ہم آپس میں باتیں کرنے لگے کہ اگر ہم میں سے کوئی گر جائے تو اس کا کیا حال ہو۔ یہ تو اس کی بوٹی بوٹی ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیں گے۔ اب ہماری فائرنگ مدھم پڑ گئی۔

اب زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی کوئی نشانہ خالی نہیں جانا چاہئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمنوں کو ہماری کمزوری کا احساس ہو گیا ان کی حملہ آوری اور جارحیت کئی گنا بڑھ گئی جیسے انہیں اپنی فتح مندی کا یقین ہو۔ ہمارے ایک دوست نے مذاق میں کہا کہ یارو ہم آئے تھے بااقتدار حملہ آور بن کر لیکن اب مدافعت پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس کے اس مذاق کا جواب ہم مذاق سے نہ دے سکے کیونکہ اس وقت ہماری سٹی گم تھی۔ ہم صحیح طور پر ہنس تو کیا مسکرا بھی نہ سکے۔ اب ہم نے فائرنگ بند کر دی کہ جو چند کارتوس بچ گئے وہ بھاگتے وقت کام آئیں گے ہمیں اپنے تحفظ کے لئے بھی کارتوسوں کی ضرورت تھی۔

اب شام ہو گئی پھر دھندلکا بھی کافور ہوا۔ ہم نے مشورہ کیا کہ اب کیا کریں؟ طے پایا اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ کر کھانا کھانا چاہئے ہم نے کھانا شروع کیا سور جیسے ہماری طرف سے اندھے گونگے بہرے ہو گئے تھے یا وہ ہم سے اتنے خفا تھے یا وہ ساتھیوں

کی ہلاکت پر اس قدر برہم تھے کہ انہوں نے ہماری طرف دیکھا تک نہیں۔ کھانا کھا کر جان میں جان آئی۔ سوروں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ہم نے سوچا کہ اگر ہم انہیں نہیں چھیڑیں گے تو یہ خود واپس چلے جائیں گے ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے اور ان کارتوسوں کی گنتی بھی کر رہے تھے جو باقی بچ گئے تھے۔

جانے سوروں کو کیا ہوا کہ ان کی صفوں میں ہلچل مچ گئی لگتا تھا جیسے وہ اپنی گنتی کر رہے ہوں۔ انہوں نے سوچا ہو گا یہ جو اچانک اتنی دیر سے فائرنگ بند ہے تو اس میں کوئی راز ہے ہم نے آپس میں مشورہ کیا کہ اتنی خاموشی بھی ٹھیک نہیں اس طرح انہیں ہماری کمزوری کا پتہ چل جائے گا۔ اس لئے ہم چاروں نے وقفے وقفے سے فائر کھولے اور ایسے سوروں کو نشانہ بنایا جو اپنی جانوں کی پروا کئے بغیر جڑ پر پہنچ گئے اور تنے پر چڑھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ہمیں پتہ بھی نہ چلا اور جنگل پر اندھیرا سیاہ چادر کی طرح پھیل گیا۔ اب ہم واقعی پریشان تھے کہ کیا کریں یہ تو جانے کا نام ہی نہیں لیتے تھے ہم نے اتنے ہٹے کٹے سوروں کا جنازہ نکال دیا تھا کہ جب نئے نئے شکاری انہیں اپنے کندھوں پر ڈال کر جائیں گے تو خوب شہرت ملے گی۔ نعرے لگیں گے اور ایوارڈ ملیں گے۔ ہماری جواں مردی اور بلند ہمتی کے برسوں گن گائے جائیں گے۔ ہم نے ایک دوسرے سے مشورہ کیا کہ اب کیا کریں سب نے یہی کہا کہ اب سو جائیں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ اگر ہم اسلحہ سے لیس ہوتے تب بھی اس قدر گھپ اندھیرے میں جنگ کرنا ناممکن تھا۔

ہمارے ایک دوست نے کہا کہ سور آگ سے ڈرتے ہیں، لکڑی جمع کر کے آگ جلائیں، یہ بھاگ جائیں گے۔ اس پر دوسرے نے کہا کہ تم جمع کر لاؤ۔ اس پر قہقہہ پڑا جو بعد میں ہلکا ہلکا تبسم اور میٹھی میٹھی نیند میں تبدیل ہو گیا۔

یہ خواب خرگوش نہ تھا ورنہ ہم صبح اٹھتے، یہ اضطراب اور تھکن کی نیند تھی اس لئے رات کو ہی اٹھ گئے جو نہیں اٹھا اس کو اٹھا دیا۔ نیچے ہمارے دشمنوں کے درمیان صلاح و مشورہ جاری تھا۔ اندھیرے میں ہمیں نظر آرہا تھا کہ کچھ ٹولیاں واپس جا رہی تھیں ہم نے سوچا شاید یہ واپس جا رہے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو بتایا تو ایک نے کہا کہ غلط سوچتے ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہماری فائرنگ سے ان کا لشکر دوبارہ محاصرہ کرے، مگر یہ جاتے کیوں نہیں؟ یہ ڈیرا ڈال کر کیوں بیٹھ گئے ہیں؟ ہمارے ایک دوست کی رگ ظرافت پھڑکی تو اس نے لقمہ دیا، ڈیرا ڈال کر نہیں دھونی جما کر کہو۔ تمہارے عشق میں سور ہی مبتلا ہو سکتے ہیں۔

بالآخر صبح ہوئی، ہم چاہ رہے تھے کہ سورج ابھرے تو ہم غور سے دیکھیں کہ کل میدان میں جو گھمسان کا رن پڑا تھا، اب اس کی کیا حالت ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی لاشوں کو اٹھا کر لے گئے ہیں یا

اب بھی وہیں پڑی ہیں۔

دن کے اجالے میں ہم نے دیکھا تو بھونچکارہ گئے۔ دہشت کے مارے ہماری جان نکل گئی۔ جس درخت پر ہمارا بسیرا تھا۔ اس کی جڑ کے چاروں طرف ایک بہت بڑا گڑھا کھودا جا چکا تھا۔ جڑ کھوکھلی ہو چکی تھی۔ بنیادیں ہلنے والی تھیں۔ معلوم ہوا کہ سور تمام رات مل کر محنت، کاریگری اور تدبر کے ساتھ یہی کام کرتے رہے تھے۔ اپنی کسی خداداد صلاحیت، اپنی کسی غیر معمولی جبلت کے تحت انہوں نے اپنی تھوتھنیوں سے منوں مٹی ہٹالی تھی اور تیز نوکیلے دانتوں سے جڑ کو کتر کتر کر پھینک دیا۔ اور ہم کس خوبصورتی سے سوتے رہے اور وہ جاگتے رہے۔

بس ابھی کچھ ہی دیر میں یہ درخت جس پر ہم تھے جڑ سے اکھڑنے والا تھا۔ یہ کسی وقت گر پڑے گا اور اسکے ساتھ ہی ہم دشمنوں کے بیچ گرے پڑے ہوں گے اور یہ ہمیں آناً فاناً پھاڑ کھائیں گے۔

یہ لمحہ ایسا تھا کہ ہماری زبانیں گنگ ہو گئیں۔ ہمارے ذہن مفلوج ہو گئے ہم مصیبت کے وقت ایک دوسرے سے مشورہ کرنا بھی بھول گئے اور جو چند کارتوس باقی تھے گھبراہٹ کے مارے وہ بھی خالی کر لئے چند سور اور مر گئے لیکن زندوں میں اشتعال اور بڑھ گیا تب ہمیں معلوم ہوا کہ قدرت نے انہیں بھی ذہانت دے رکھی ہے وہ گولیوں کی بوچھاڑ میں بھی ثابت قدمی سے درخت کی جڑیں کھوکھلی کرتے رہے۔

اب ہماری فائرنگ بند ہو گئی اور ہماری بندوقوں میں ایک گولی بھی نہ رہی ہم اب کیا کر سکتے تھے سوائے اس کے کہ بڑی بے بسی، بے چارگی اور خاموشی سے تازہ کھودی ہوئی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سونگھتے رہیں۔ سور تیز دانتوں سے جڑ کتر رہے تھے اور بار بار درخت کو زور دے کر گرانے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ ہم جان گئے کہ اب فرار ممکن نہیں، ہر جگہ یہ وحشی مسلط تھے۔ ہم چاروں کو بیک وقت احساس ہوا کہ جانور انسان کی فطری سنگدلی کا انتقام لینے پر تلے ہوئے ہیں۔

دہشت مجھ پر اتنی سوار تھی کہ بغیر کچھ جانے اپنے جھولے میں کھڑا ہو گیا پھر اسی رسی کی گرہ پر جو اوپر کی جانب بندھی ہوئی تھی میں نے اپنا قدم مضبوطی سے جمالیا۔ ہوا میں توازن درست کیا، پھیپھڑوں میں ہوا بھری اور پوری قوت سے اور زور سے چھلانگ لگائی اور ساتھ والے درخت کی ٹہنی پر جا پنجا میں گرتے گرتے بچا۔ اس ٹہنی سے دوسری اور پھر تیسری پر قدم رکھتا چلا گیا۔ محسوس ہوا کہ جیسے میں بنیادی طور پر بندر ہوں اور اپنے اجداد کی نوع کی بھولی ہوئی عادتوں کو دہرا رہا ہوں۔ اچانک ایک خوفناک آواز آئی اور پھر درد ناک انسانی چیخیں۔ وہ درخت جڑ سے اکھڑ کر گر پڑا تھا اور میرے تینوں دوستوں کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ میں

خوف کے مارے درخت کی ٹہنی سے چمٹ گیا۔ میں کانپ رہا تھا کچھ دیر بعد سور منتشر ہو گئے جان بچانے کی خواہش میرے اندر جاگی اور اعضا میں قوت سرسرانے لگی۔ اور میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا تو دور دور تک سور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں مارچ کر رہے تھے اور آوازیں نکال رہے تھے۔

جب میں نے دیکھا کہ سب چلے گئے تو میں درخت سے اترا۔ خوف کے مارے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا میں اپنی جھونپڑیوں کی طرف بھاگا جہاں وہ تین ریڈ انڈین ہمارا انتظار کر رہے تھے لیکن فرض شناسی نے میرے قدم روک لئے۔ میں نے سوچا شاید میرے ساتھوں میں سے ابھی کوئی زندہ ہو تو اسے کندھے پر اٹھاتا چلوں۔

میں جڑ سے اکھاڑے ہوئے درخت کے پاس پہنچا تو جو کچھ میں نے دیکھا۔ اس سے کھوپڑی میں میرا دماغ ہل کر رہ گیا۔ لگتا تھا ابھی چکرا کر گر پڑوں گا۔ میں نے دیکھا ان کے کپڑوں کی دھجیاں ان کی جرابیں اور جوتے، بس..... ان کے وجود کا کوئی اور حصہ دکھائی نہ دیا۔ نہ ہاتھ، نہ پاؤں، نہ کلائیاں نہ انگلیاں، حتیٰ کہ ان کے بال تک سوروں نے ہڑپ کر لئے۔ پھر میں دیوانہ وار ان نشانیوں کی رہنمائی میں دریا کی طرف بھاگنے لگا جو ہم چاروں نے مل کر دو روز قبل قائم کی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ دوبارہ میں اپنی زندگی میں اتنی تیزی سے نہیں دوڑ سکتا۔ دوڑتے وقت میرے اعضا الگ الگ ہو گئے۔ میں جھونپڑی میں پہنچا۔ کشتی بندھی تھی لیکن وہ تینوں ریڈ انڈین فرار ہو چکے تھے۔ میں بخار میں تپتا رہا پھر آرام آنے پر کشتی لے کر بھاگا۔

میں نے عہد کر رکھا ہے کہ آئندہ کبھی شکار نہ کروں گا۔ جہاں تک میرے بس میں ہو گا خون خوار اور تخریب پسند جانوروں کو نیست و نابود کروں گا۔ تفریح کے لئے شکار نہ کھیلوں گا۔ قتل برائے قتل کی لذت سے میں باز آیا۔ (ماخوذ)

●●

مزید محنت کی ضرورت ہے

ایک دفعہ کا ذکر ہے، نعیم مشتاق نومی۔ انوکھا کرتب، عبدالرسول سومرو، سبی۔ ماں کی عظمت، منیر خان صادق کوہاٹ۔ بھائی کی محبت، شیر نواز گل پشاور۔ صورت بھلی کہ سیرت، تابندہ ملک راولپنڈی۔ قصہ ایک سکائی لیب کا، اورنگ زیب عالمگیر جہلم۔ کامن سینس، صفیہ سلطانہ صدیقی، کراچی۔ مایوسی گناہ ہے، شاہد الرحمٰن چوہدری، سرگودھا۔ مذاق ہی مذاق میں، ملیحہ ثانیہ سحرش۔ جنگل کا راز، رومیلہ سرور، تربیلا ڈیم غازی۔ ذہانت، ایم اعجاز احمد، کراچی۔ سب بچے مظلوم بچے، محمد بن مالک، کراچی۔ اپنی مدد آپ، راشد محمود۔ شرابی ولی ہوگیا، مدثر یعقوب ٹوانہ، لاہور۔ باتیں کھری کھری، عطاء اللہ بھٹو گھوٹکی۔ تاریخ ساز ریل گاڑی، محمد رشید احمد خانیوال۔ چھوٹا آدمی، فیصل حسین صدیقی، کراچی۔ بے احتیاطی، محمد فہیم ٹنڈو محمد خان۔ ناگواری، حفصہ صدیقی، کراچی۔ بہار سے خزاں تک، آر ایم راہی، کراچی۔ مینار، محمد مجاہد منہاس، منڈی بہاؤالدین۔ محبت کے زینے، سلطان محمود، جہلم۔ اسپورٹس پزل واجد رضا اصفہانی۔ شہباز اور ڈاکو۔ محبت، چیونٹی اور راز عطیتہ النساء۔ جین آئز، ابو الکلام خالد رفیق۔ حمد، جنید حفیظ اسلام آباد۔ ماں، مراد ہاشمی فیصل آباد۔ عزم، مسز رضیہ عزیز۔ اک جنت کی آرزو تھی، جدون ادیب۔ روشن باتیں، جمعہ خان، حیدر آباد۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ صوفیہ سلطان، کراچی۔ غم کی دنیا، حافظ عبدالقیوم، کراچی۔ تربیت، حافظ عبدالقیوم، کراچی۔ گینز بک، کاشف مرزا، بورے والا۔ ورلڈ کپ، شہریار علی۔

سُن ونجلی دی مٹھڑی تان وے

تیز رفتار ککڑ کار

اٹلانٹا اولمپک 96

جو دعوے تھے بے کار گئے
سب حرف گئے ہم ہار گئے

اولمپک کے نئے معرکے

یحییٰ حسینی

ویٹ لفٹنگ میں نیا عالمی ریکارڈ

چین کے ویٹ لفٹر ننگشنگ نے انڈر ۵۹ کے بی کیٹگری میں ۵ء۳۰۷ کلوگرام وزن اٹھا کر عالمی ریکارڈ قائم کیا اور اس کے ساتھ ساتھ طلائی تمغہ بھی جیتا۔

اٹلانٹا اولمپکس کا سب سے بڑا ہجوم

خواتین کے باسکٹ بال میں اولمپک کی تاریخ کا سب سے بڑا ہجوم امریکہ اور زائر کے میچ میں دیکھا گیا یہ میچ امریکی خواتین نے ۴۷-۱۰۷ سے جیت لیا۔ کراؤڈ کی تعداد ۳۱۲۳۰ تھی۔

چین بارہ سال بعد ویٹ لفٹنگ میں طلائی تمغہ

چین کے ویٹ لفٹر ٹینگ لنگ شینگ نے بینٹم ویٹ میں نیا عالمی ریکارڈ قائم کرتے ہوئے ۱۰۷ کلو گرام وزن اٹھا کر ویٹ لفٹنگ میں چین کے لئے اولمپکس میں بارہ سال بعد تمغہ حاصل کیا۔

ایک تیراک دو طلائی تمغے

روس کے تیراک ڈینس پینتھرا کون نے سو میٹر بٹر فلائی اور دو سو میٹر بٹر فلائی میں طلائی تمغہ حاصل کیا۔ سو میٹر بٹر فلائی میں انہوں نے اپنے ہی قائم کئے ہوئے ورلڈ ریکارڈ کو توڑا۔ ۷۲-۱ء کے میونخ اولمپک کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب کسی تیراک نے سو میٹر بٹر فلائی اور دو سو میٹر بٹر فلائی دونوں میں طلائی تمغہ حاصل کیا۔

آئرلینڈ اولمپکس میں پہلا طلائی تمغہ

چار سو میٹر پیراکی کے مقابلے میں آئرلینڈ کی خاتون تیراک نے اپنے ملک کی تاریخ میں پہلا طلائی تمغہ حاصل کیا۔

پہلی خاتون ریفری

کینیڈا کی سونیا ڈینون کورٹ اولمپک فٹبال کی تاریخ کی پہلی ریفری بن گئیں انہوں نے اٹلانٹا اولمپکس میں جاپان اور جرمنی کے مردوں کے میچ میں یہ اعزاز حاصل کیا۔

تیراکی کا نیا عالمی ریکارڈ

بیلجیئم کے فریڈی برگ ریو نے سومیٹر برسٹ اسٹروک میں نیا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ انہوں نے ہیٹ کے دوران ایک منٹ ساٹھ سیکنڈ میں نیا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ جبکہ اس سے قبل عالمی ریکارڈ ایک منٹ ۹۵ سیکنڈ تھا جو اگست ۱۹۹۳ء میں ہنگری کے پیراک کروی گٹلو نے قائم کیا تھا۔

اٹلانٹا اولمپکس کا پہلا تمغہ

پولینڈ کی خاتون رینیٹا میوئر نے اٹلانٹا اولمپکس کا پہلا گولڈ میڈل جیتنے کا اعزاز حاصل کیا۔ میوئر نے ویمنز شوٹنگ ایئر رائفل مقابلے میں ۶ء۴۹۷ پوائنٹس حاصل کر کے گولڈ میڈل، جبکہ جرمنی کی پیٹرا ہورنیبرا نے ۴ء۴۹۷ پوائنٹس لے کر سلور اور یوگو سلاویہ کی الیگزینڈرا آئیووسیف نے کانسی کا تمغہ حاصل کیا۔

ہائی جمپ کا نیا اولمپک ریکارڈ

ہائی جمپ میں بلغاریہ کی خاتون اسٹفیکا کوسٹاڈینوف نے اولمپک کا نیا ریکارڈ قائم کرتے ہوئے طلائی تمغہ جیتا۔ اسٹفیکا نے ۲ء۰۵ میٹرز ہائی جمپ کا سابقہ ریکارڈ دو سینٹی میٹرز کے فرق سے توڑا۔

مائیکل جانسن اور میری جوزی پیرک کا اولمپک ڈبل

اولمپک ٹریک مقابلوں میں ۲ سیاہ فام کھلاڑیوں نے ایک نئی تاریخ رقم کر کے دنیا کو حیران کردیا۔ ان دونوں کھلاڑیوں نے ۴۰۰ میٹر کے بعد ۲۰۰ میٹر میں بھی گولڈ میڈل جیت کر اولمپک ڈبل مکمل کرلیا۔ امریکہ کے مضبوط اعصاب اور قوت ارادی کے مالک اتھلیٹ ۲۸ سالہ مائیکل جانسن اور فرانس کی پر اعتماد دراز قد میری جوزی پیرک، جنہوں نے اس بار کھیلوں کی تاریخ میں اپنے نام سنہری حروف سے لکھوائے۔ برق رفتار مائیکل جانسن نے ۲۰۰ میٹر کا فاصلہ ۱۹.۳۲ سیکنڈ میں طے کر کے نیا عالمی ریکارڈ قائم کردیا۔ انہوں نے جون میں اولمپک ٹرائلز اٹلانٹا میں یہ فاصلہ ۱۹.۶۶ سیکنڈ میں طے کر کے ریکارڈ قائم کیا تھا ۲۰۰ میٹر کا اولمپک ریکارڈ ۹۲ء بارسلونا میں امریکی اتھلیٹ مائیک مارش نے ۱۹.۷۳ سیکنڈ کے ساتھ قائم کیا تھا۔ مائیکل جانسن نے ۴۰۰ میٹر میں بھی ریکارڈ قائم کیا تھا۔ وہ اولمپک تاریخ کے پہلے کھلاڑی ہیں جنہوں نے اولمپک ڈبل

شور

عدیل اسلم

جزیرہ ہوائی میں ایک چھوٹا سا قصبہ کوالاپو تھا۔ نہایت ہی خوبصورت تفریحی مقام تھا۔ یہاں کا موسم بے حد خوشگوار تھا اور یہاں کے رہائشی بھی دوستانہ طبیعت کے تھے۔ یوں تو چھوٹا سا قصبہ تھا لیکن یہاں پانی اسٹور کرنے کے لئے دنیا کا سب سے بڑا تالاب تھا جس میں لاکھوں گیلن پانی اسٹور ہو سکتا تھا۔ اور پھر قصبے کی ضرورت کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس کے شمال میں ۱۰۱۷ فٹ اونچی پہاڑی تھی اور اس کا نام بھی کوالاپو تھا یہیں پر ایک بورڈنگ اسکول تھا جس کا نام کسی زمانے میں لارنس بورڈنگ اسکول تھا، لیکن اب لوگوں نے اسے "شور والا اسکول" کا نام دے دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسکول میں ہر وقت شور مچا رہتا تھا، یہاں ہر کوئی شور مچاتا تھا، یہ اسکول قصبے کے رہائشی علاقے سے ذرا ہٹ کر تھا لیکن اس کا شور اتنا تھا کہ دور دور تک سنا جا سکتا تھا، اسی لئے

تو لوگ اسے "شور والا اسکول" کہتے تھے' بچوں کی بات تو چھوڑیئے اس اسکول کے اساتذہ' پرنسپل تک ہر وقت گرجتے برستے رہتے تھے اور ان کی آوازیں سارا دن گونجتی تھیں۔ جو خطرناک حد تک اونچی ہوتی تھیں۔ یہاں کا چپڑاسی بھی کوئی کام آہستہ آواز میں نہیں کر سکتا تھا' جب وہ گھنٹی بجاتا تو اس زور سے ہتھوڑا مارتا کہ سارا قصبہ ہل کر رہ جاتا' اساتذہ اتنی اونچی آواز میں سبق پڑھاتے کہ گویا کلاس میں موجود بچوں کو نہیں بلکہ سارے قصبے کو سبق پڑھانا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بچے کلاس میں اتنا شور کر رہے ہوتے تھے کہ اگر وہ آہستہ آواز میں بولتے تو ان کی کسی کو سمجھ ہی نہ آتی۔ لیکن یہ بات بھی تھی کہ وہاں کے ہر فرد کو اونچی آواز میں بولنے کی اتنی عادت ہوگئی تھی کہ وہ آہستہ آواز میں بات کرنا' بلکہ آہستہ آواز کو ہی بھول گئے تھے۔ بچے چیختے تھے' ایک دوسرے کو مارے رہتے تھے' ٹیچران کو چیخ چیخ کر خاموش ہونے کا حکم دیتے' پرنسپل صاحب جن کا نام مسٹر ٹامس تھا ٹیچروں پر چیختے تھے۔ اور یوں سارا دن یونہی بک بک کرتے گزر جاتا۔ یہاں پر اونچی آواز میں بولنے کی عادت کی بڑی بڑی مثالیں موجود تھیں۔' مثال کے طور پر ایک بار ایک طالب علم جان الیسٹر کو بخار ہوگیا' اسکول کے مریل سے ڈاکٹر کو بلوایا گیا' پہلے تو اس نے چیخ چیخ کر مریض سے چند سوالات کئے جیسے وہ کسی کمرے میں نہیں اسٹاک مارکیٹ میں کھڑا ہے' پھر اس نے جان کو چند دوائیاں دیں جن کے اثر سے اسے نیند آگئی' ڈاکٹر صاحب کچھ دیر بعد اس کا معائنہ کرنے آئے' پھر جب جانے لگے تو اس کے دوست سے کہنے لگے۔ "یہ سو رہا ہے' اب اسے تنگ مت کرنا اور خاموش رہنا۔" اور جناب' یہ بات اس نے اتنی اونچی آواز میں کہی کہ مریض بیڈ سے کئی فٹ اونچا اچھلا اور دھڑام سے نیچے جا گرا۔ "اے تم سو کیوں نہیں رہے" ڈاکٹر چیخا۔ اب بے چارہ جان اسے کیا کہتا۔

"بہر حال اب تم سو جاؤ' ورنہ طبیعت مزید بگڑ جائے گی۔"

جان نے آنکھیں بند کرلیں اور تھوڑی دیر بعد سو گیا' ڈاکٹر صاحب اسے دیکھتے رہے اور اٹھ کر باہر چلے گئے' لیکن جاتے جاتے دروازہ اس زور سے بند کیا کہ اس بار جان کے ساتھ ساتھ' دیواروں پر لگیں تصویریں تک زمین پر گر پڑیں۔

اس اسکول کا کوئی فرد جب قصبے میں جاتا تو اسے یوں لگتا جیسے تیسری جنگ عظیم چھڑنے سے سارے انسان ختم ہوگئے ہیں اور اس اسکول کے کسی بھی فرد کو دیکھ کر لوگ کانوں میں انگلیاں اور کچھ روئیاں ٹھونس لیتے تاکہ اس کی چیخ و پکار سے بچ سکیں۔ بہر حال اب ایک نیا مسئلہ کھڑا

ہو گیا تھا اور پرنسپل ٹامس بے حد پریشان تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ اسکول کو چندہ دینے والی ایک بہت بڑی سماجی شخصیت' دورے کے لئے آرہی تھی اور پرنسپل ٹامس یہ جانتا تھا کہ اگر اسکول کی یہی حالت اس نے دیکھ لی' تو ان بچوں کی بدتمیزیوں سے ناراض ہو کر وہ چندہ دینا بند کردے گا جس سے بہت نقصان ہوگا۔ چنانچہ اس نے اسکول کے تمام بچوں کو جمع کیا تاکہ ان سے خطاب کرسکے۔

"اس وقت میں نے آپ لوگوں کو نہایت ہی اہم بات کرنے کے لئے جمع کیا ہے۔" پرنسپل ٹامس چیخا۔ اور اس زور سے چیخا کہ قصبے میں بہت سے لوگ رک گئے کہ شاید ان سے کسی نے کچھ کہا ہے' بہرحال انہیں جلد ہی علم ہوگیا کہ آواز کہاں سے آئی ہے اور وہ اپنے کام دھندوں سے لگ گئے۔

"دراصل پرسوں کاؤنا کاکائی سے مسٹر جارج' سیٹونسن' جو کہ بہت بڑی سماجی شخصیت ہیں اور ہمارے اسکول کو بہت بڑا چندہ دینے والوں میں سے ہیں' تشریف لارہے ہیں لیکن ہمارے اسکول کی یہ حالت دیکھ کر یقیناً" وہ خوش نہیں ہوں گے۔ اس لئے میں تم لوگوں کے سامنے ایک شرط رکھ رہا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ اگر تم لوگوں نے پرسوں سارا دن نہایت خاموشی سے نہایت نظم وضبط سے گزارا تو ہم مسٹر جارج کے جانے کے بعد ایک خاص دن منائیں گے' جس میں ہر کسی کو ہر کام کرنے کی اجازت ہوگی' کوئی روک ٹوک نہ ہوگی۔ اور ہم سب قصبے کے خوبصورت ترین مقام یعنی کوالاپو کی پہاڑی پر پکنک منائیں گے۔"

اس اعلان نے بچوں میں جوش و خروش کی لہر دوڑادی اور انہوں نے اسے قبول کرلیا پرنسپل ٹامس بے حد خوش ہوا۔ اب اس کی پریشانی کافی حد تک ختم ہوگئی تھی۔ بہرحال مسٹر جارج کے آنے کی تیاریاں ہونے لگیں' بچوں کو سمجھایا جانے لگا کہ انہیں کیا کرنا ہوگا' کس اخلاق سے پیش آنا ہوگا اور کوئی بدتمیزی نہ کرنی ہوگی۔

اور پھر وہ دن آگیا جب مسٹر جارج کو آنا تھا۔ پرنسپل ٹامس نے بڑے تپاک سے ان کا استقبال کیا' بچوں نے ویلکم کیا حیرت انگیز طور پر بچوں نے پرنسپل ٹامس کی بات مان لی تھی اور بہت تمیز داری کا ثبوت دے رہے تھے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی بچے ہیں جو رات کو سوتے بھی آرام سے نہیں۔

مسٹر جارج کو پھر ہال میں لے جایا جانے لگا۔

"میں نے سنا تھا کہ یہاں کے بچے بہت بدتمیز ہیں اور اس اسکول میں اتنا شور ہوتا ہے کہ قصبے میں دور دور تک سنا جاسکتا ہے۔" مسٹر جارج نے چلتے چلتے پرنسپل ٹامس سے کہا "جھوٹ بات ہے

بالکل سر' آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اسکول کے بچوں میں کتنا نظم وضبط ہے۔ یہ سب دشمنوں کی اڑائی خبریں ہیں جو ہم سے جلتے ہیں۔"

پھر وہ ہال میں پہنچ گئے جہاں سب بچے جمع تھے اور نظم وضبط کی تصویر بنے بیٹھے تھے پرنسپل صاحب اور مسٹر جارج چند دوسرے ٹیچرز کے ہمراہ اسٹیج پر چلے گئے جہاں ایک ڈائس تھا اور پیچھے بیٹھنے کو کرسیاں تھیں۔ پہلے پرنسپل ٹامس نے جارج کی شان میں قصیدے پڑھے اور پھر انہیں تقریر کے لئے دعوت دی۔ بچوں کی تالیوں کی گونج میں مسٹر جارج ڈائس پر پہنچے' پہلے انہوں نے بچوں پر ایک شفقت بھری نظر ڈالی اور پھر گویا ہوئے۔ "پہلے اس اسکول کے بارے میں بہت سی ناخوشگوار باتیں سنیں' جن پر مجھے بہت حیرت ہوئی' پہلے پہل تو میں نے یقین نہ کیا لیکن پھر جب بہت سے لوگوں نے ایسی باتیں کی تو میں نے اس دورے کا پروگرام بنایا۔ لیکن یہاں آکر میں نے آپ لوگوں کا جو نظم وضبط دیکھا اس سے مجھے بے انداز مسرت ہوئی۔"

کچھ بچوں نے جماہیاں لیں' کچھ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کچھ نے کرسی کو ہلکا سا ہلا کر جھولا لیا۔ اس وقت پرنسپل ٹامس کو بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ اتنی خاموشی تھی کہ ہال میں جیسے زندہ لوگ نہیں ہیں۔ ایسی خاموشی تو کبھی بھی نہ ہوئی تھی۔ کمرے میں صرف مسٹر جارج کی آواز گونج رہی تھی' وہ بھی درمیانی سی۔ پرنسپل ٹامس کو اس وقت نہ جانے کیوں یہ خواہش ہونے لگی کہ مسٹر جارج جلد از جلد یہاں سے چلے جائیں لیکن پھر انہوں نے اپنے آپ کو سمجھایا اور مسٹر جارج کی باتیں سننے لگے۔

"اسکول میں آپ پر سختی بھی ہوتی ہوگی۔ لیکن پیارے بچو! یہ سب کچھ آپ کے بھلے کے لئے ہے۔ آگے جاکر آپ کو اس کی افادیت کا اندازہ ہوگا۔ اور آپ میری بات کو سچ جانیں گے' یہ سب کچھ ہم اس لئے بھی کرتے ہیں کیونکہ آپ لوگ اس قوم کا مستقبل ہیں' آگے جاکر آپ کو اس ملک کو سنبھالنا ہے' چنانچہ آپ کے اساتذہ' آپ کو اچھا' باشعور اور ملک کے لئے فائدہ مند شہری بنانے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔"

پرنسپل ٹامس کو اب بے چینی کے ساتھ ساتھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ کوئی شہد کی مکھی اس کے کان کے پاس آکر بھنبھنا رہی ہے' اور یہ احساس اتنا شدید تھا کہ اس نے سر گھما کر کئی بار دیکھا' لیکن کوئی مکھی نہ پاکر شرمندہ ہوگیا۔ بہرحال بھنبھنانے کی آواز آرہی تھی اور واضح طور پر اونچی ہو رہی تھی۔

"اس لئے ایک طرح سے آپ کے اساتذہ

کا بہت احسان ہے آپ پر آپ کو ہمیشہ ان کا احسان مند رہنا ہوگا کہ انہوں نے آپ پر کتنی محنت کی۔" اب پرنسپل ٹامس کو محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے کان کے پاس ایک نہیں بلکہ دو تین مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ ساتھ میں بے چینی بھی بڑھتی چلی جا رہی تھی یہ خاموشی اسے بے چین کر رہی تھی اور ایسے میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ۔ پرنسپل پریشان ہو گیا تھا اور اس نے ایک دو بار ساتھ بیٹھے ٹیچروں کو بھی دیکھا لیکن ان کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہ تھا جس سے اندازہ ہو سکے کہ وہ بھی یہ بھنبھناہٹ سن رہے ہیں' "تو پیارے بچو! تم لوگوں پر اب فرض ہے کہ دل لگا کر پڑھو' تاکہ اپنے والدین کا' اپنے اساتذہ کا نام روشن کر سکو۔" بچے اب بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے۔ انہیں بوریت محسوس ہونے لگی تھی' لیکن مسٹر جارج کی تقریر شیطان کی آنت کی طرح ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

اب پرنسپل ٹامس کی حالت خراب ہونے لگی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کہ اس کے آس پاس' ایک دو' یا تین مکھیاں نہیں ہیں' بلکہ اس نے شہد کی مکھیوں کے چھتے میں سر دے دیا ہے۔' اور حیرت کی بات ہی تھی کہ آوازیں الگ الگ نہ تھیں سب مکھیاں بالکل ایک ہی وقت میں بول رہی تھیں اور ان کی یہ بھنبھناہٹ اتنی تیز تھی کہ پرنسپل ٹامس اپنا سر پکڑنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں لیکن کوئی فرق نہ پڑ سکا۔

مسٹر جارج کی تقریر جاری تھی۔

پرنسپل ٹامس کو اب محسوس ہو گیا تھا جیسے یہ آواز اسے پاگل کر دے گی' وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے گا۔ اس نے اپنا سر مضبوطی سے دبا رکھا تھا۔ لیکن آواز اس کے دماغ پر اثر کر رہی تھی' وہ محسوس کر رہا تھا کہ اپنا ضبط کھو رہا ہے' وہ کسی بھی لمحے پھٹ سکتا ہے۔

"تو میرے عزیز بچو!....." مسٹر جارج اتنا ہی کہہ سکے اسی وقت پرنسپل ٹامس اٹھ کھڑا ہوا اور سارے بچوں اور ٹیچروں کی توجہ اس کی طرف ہو گئی۔ پھر اس کی دھاڑتی ہوئی' بلکہ کانوں کو پھاڑتی ہوئی آواز ہال میں گونجی۔ "نالائقو' گدھو! کیا تمہیں مکھیوں کی آواز نہیں آ رہی؟ انہیں ڈھونڈتے کیوں نہیں' یہ مجھے پاگل کر رہی ہیں' ڈھونڈو انہیں بے وقوفو!" ہال میں اب یکدم بالکل ہی سناٹا چھا گیا' سب پرنسپل ٹامس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے' اور اس وقت پرنسپل ٹامس کو یہ احساس ہوا کہ ہال میں بالکل خاموشی ہے' مکھیوں کی بھنبھناہٹ مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے اور ہال میں اتنی خاموشی ہے کہ سوئی گرنے کی آواز بھی واضح طور پر سنی جا سکتی ہے اس نے

خوفزدہ نظروں سے مسٹر جارج کی طرف دیکھا جو حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے اور پھر یکدم بچوں نے طوفان مچادیا، ان کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، انہوں نے شور مچانا شروع کردیا، "ڈھونڈو مکھیاں، ڈھونڈو" ہر طرف ایک قیامت بپا ہو گئی، ٹیچر، بچوں کو خاموش کروانے کے لئے چیخنے لگے، سب کے جو لوگ جو صبح سے حیران تھے کہ آج اتنی خاموشی کیسے ہے، اب مطمئن انداز میں سر ہلا رہے تھے، بچے کرسیوں کو الٹا پلٹا کر رہے تھے، چیخ رہے تھے کہ ڈھونڈو مکھیاں، ٹیچر چیخ رہے تھے کہ چپ ہو جاؤ اور ...... اور پرنسپل ٹامس سر جھکائے کھڑا تھا جب کہ مسٹر جارج اس پر برس رہے تھے ....

کیا آپ ناراض ہیں؟

اگر آپ

- اس لئے ناراض ہیں کہ آنکھ مچولی میں بھیجی ہوئی تحریر شائع نہیں ہوئی تو ذرا سوچیئے کہ ایسا کیوں ہوا؟
- کیا آپ کی تحریر نقل شدہ تھی۔؟
- پہلے شائع ہو چکی تھی؟
- صفحے کے دونوں طرف اور لائن چھوڑے بغیر لکھی گئی تھی۔
- پنسل سے یا اتنے مشکل رسم الخط میں لکھی گئی تھی کہ پڑھی نہیں جارہی تھی؟
- چھوٹے پرزوں پر لکھی گئی تھی؟
- ایک ہی صفحے پر بہت سی تحریریں لکھی گئی تھیں؟
- آپ کی تحریر کا انداز بیان، خیال اور اسلوب بچوں کی نفسیات سے ہٹ کر تھا؟
- آپ کی تحریر مشکل اور گنجلک تھی؟
- آپ کی تحریر میں مقصدیت کا فقدان تھا۔؟
- تو پھر سوچیئے کہ آپ کی تحریر کیونکر شائع ہو سکتی تھی۔
- اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی تحریر شائع ہو تو اوپر بیان کی گئی تمام باتوں سے بچیں۔
- یاد رکھیئے! بڑا ادیب بننے کے لئے مطالعہ اور مسلسل محنت بہت ضروری ہے۔

(ادارہ)

بی آر بی کی کہانی

شیخ عبدالحمید عابد

۱۹۶۵ء چھ ستمبر کی رات کے آخری پہر میں تاریکی سے فائدہ اٹھا کر ہندوستانی افواج نے پاکستان پر حملہ کیا تو بی آر بی نہر نے ہمدرد بہن کا روپ دھار لیا۔ اس نے نہ صرف دشمن کے بڑھے ہوئے قدم روک دیئے بلکہ اپنے ہم وطنوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کردیا اور انہیں یہ احساس دلایا کہ دشمن تمہارے گھر میں آگھسا ہے۔ بیدار ہوجاؤ۔ پاکستانی افواج کے جوان دشمن کے متوقع حملے کا استقبال کرنے کے لئے اس نہر پر پہنچے۔ جب انہوں نے اس بی آر بی نہر کے کناروں سے دشمن پر پہلا جوابی حملہ کیا تو ہندوستانی کمانڈروں نے دوپہر تک لاہور کو ختم کر لینے کا جو خواب دیکھا تھا۔ وہ خواب بی آر بی کے بہتے پانی میں ڈوب گیا۔

نہر بی آر بی نے ستمبر کی جنگ میں وہ کردار ادا کیا ہے جو کہ جنگوں کی تاریخ میں کسی

دوسری نہریا دریا نے اس روئے زمین پر نہیں کیا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر پاکستانی اس نہر کے کنارے پر شہید ہونا دنیا و آخرت کا سب سے بڑا اعزاز سمجھتا تھا۔ دنیا میں لڑائیوں کی تاریخ میں ابھی تک کوئی موقع ایسا نہیں آیا جب کوئی حملہ آور فوج نہریا دریا کو عبور نہ کر سکی ہو۔ پانی کو عبور کرنا ان کی فتح کی علامت بن جاتا تھا **مثلاً** ۳۲۴ قبل از مسیح جب سکندر اعظم یونان سے یلغار کرتا ہوا دریائے جہلم کے کنارے پہنچا تو دریائے جہلم کے دوسرے کنارے پر سکندر پور کے مقام پر راجہ پورس لاتعداد سپاہیوں کی فوج لئے مقابلے کے لئے کھڑا تھا اور ان سپاہیوں کی مدد کے لئے بھاری بھر کم ہاتھیوں کا بھی کوئی شمار نہ تھا۔ حالانکہ سکندر کے پاس صرف گھوڑے تھے۔ اس کے باوجود سکندر نے دریائے جہلم عبور کیا اور راجہ پورس کو شکست فاش دی۔ پھر ۲۱۸ قبل از مسیح میں تیونس کے شہزادہ ہینی بال نے دریائے رون کو اس وقت عبور کیا جب رومن ایمپائر کا لشکر دریا کے دوسرے کنارے پر مورچے سنبھالے ہوئے تھا۔ ہینی بال نے طوفانی دریا کو عبور کیا اور رومیوں کو شکست فاش دی۔

پھر اپریل ۱۹۴۵ء میں ہندوستانی فوجیوں نے اٹلی میں دریائے پو کو اس وقت عبور کیا جب جرمن فوجوں نے اتحادیوں کے دو زبردست حملے ناکام بنادیئے تھے۔ اس مقام کی جنگی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اٹلی میں جرمنوں کی یہ آخری قلعہ بندی تھی۔ ظاہر ہے یہاں جرمنوں نے مقابلے کے لئے ہر قسم کی تیاری کر رکھی تھی۔ اس کے باوجود ہندوستانی فوجوں نے دریائے پو کو پار کرلیا اور جرمنوں کو اٹلی سے باہر نکال پھینکا۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ جنگ عظیم کی ہندوستانی فوج کا ذکر پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے اور اس متحدہ فوج میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد تھی جن کی شجاعت کو انگریزوں، امریکیوں اور جاپانیوں نے بھی خراج تحسین پیش کیا ہے۔

ان مثالوں سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ دنیا کی کسی لڑائی میں جب حملہ آور پوری تیاری سے آگے بڑھ رہا ہو۔ کوئی دفاعی لائن اس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے رکاوٹ نہیں بنتی۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ بی آر بی نہر ہی دنیا کی وہ واحد نہر ہے جسے عبور کرنے کے لئے ہندوستانی فوج کے لیفٹیننٹ جنرل پی کے کول نے جالندھر میں اس نہر کی لمبائی چوڑائی اور گہرائی کے عین مطابق ایک ایسی ہی نہر ۱۹۵۲ء میں بنوائی تھی اور اس وقت سے ہندوستانی فوج اس نہر کو پار کرنے کی مشق کرتی رہی تھی۔ جنرل کول نے اپنی کتاب "ان کہی

کہانی" میں اس مشق کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ لیکن ۱۳ سال کی تیاری، مشقیں، تعداد و ہتھیاروں کی برتری اور اچانک حملہ کرنے کا فائدہ حاصل ہوتے ہوئے بھی ہندوستانی فوج اس چھوٹی سی نہر کو عبور نہ کر سکی کیونکہ اس کے پانی میں ان نوجوانوں کا عکس پڑ رہا تھا جنہوں نے بی آر بی نہر کی کھدائی میں اپنا پسینہ شامل کیا تھا اور اب اس کی حفاظت کے لئے اپنے ہاتھوں کھودی ہوئی نہر میں اپنا خون شامل کرنے آگئے تھے۔ وہ جاپانی فوج کے جذبۂ خودکشی کے حامل نہ تھے۔ وہ فوج کی طرح مغرور بھی نہ تھے۔ وہ تو بدر کے تین سو تیرہ مجاہدوں، محمد بن قاسم اور طارق بن زیاد کی طرح وطن پرست، جذبۂ شہادت اور جوش جہاد لئے بدر و حنین اور قادسیہ کے معرکوں کی یاد تازہ کر رہے تھے۔

ستمبر کی سترہ دنوں کی جنگ میں دشمنوں کی توپوں نے نشانے لئے بغیر بی آر بی نہر پر لاتعداد گولے پھینکے ہوائی جہازوں سے راکٹ اور بم گرائے کہ کسی طرح اس نہر کو نقصان پہنچے اور اس میں بہتے ہوئے پانی کا نظام بگڑ جائے۔ پھر وہ آسانی سے عبور کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ لیکن دشمن اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکا۔ شاید اسے یہ احساس ہوا ہو کہ اس کی پیش قدمی کی رکاوٹ بی آر بی نہیں بلکہ

جواہر پارے

○ لوگ اونچے پہاڑوں پر سے نہیں بلکہ اکثر کنکریوں سے پھسلتے ہیں۔ (کنفیوشس)

○ ہم اکثر و بیشتر غلطیاں کرتے ہیں اور اس خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ غلطی کسی کھڑکی سے کود کر باہر نکل گئی ہے۔ حالانکہ وہ دروازے پر بیٹھی ہوتی ہے۔ (برناڈ شا)

پاکستان کے جوان اور شیر دل بیٹوں کا جذبۂ جہاد ہے۔ جنگ کے دوران بی آر بی کے پانی کا ایک قطرہ بھی کنارے سے باہر نہیں بہا کیونکہ اس کے کناروں پر لڑنے والے مجاہدوں نے یہ عزم کر لیا تھا کہ اگر دشمن اپنے ارادوں میں کامیاب ہو کر بہنے والے پانی کو خشک بھی کر دے تو یہ مجاہد اس پانی کی جگہ اپنا خون رواں کر دیں گے۔ یہ ہے مختصر سی کہانی بی آر بی نہر کی جو آج بھی پوری شان و شوکت سے بہہ رہی ہے کیونکہ اسے یقین ہے کہ اگر کبھی دشمن نے اسے تباہ کرنے کی کوشش کی تو پاکستانی فوجی اور لاہور کے لاکھوں جوان اسے اس مقصد میں کبھی کامیاب نہ ہونے دیں گے کیونکہ جنگ ساز و سامان سے نہیں جذبوں سے لڑی جاتی ہے اور پاکستان کے بیٹوں میں جذبۂ جہاد، جذبہ شہادت زندہ ہے، زندہ رہے گا انشاء اللہ۔

لطیفہ شطیفہ

ترتیب : سمن عارف

استاد شاگرد سے : "بتاؤ بے تاج بادشاہ کسے کہتے ہیں؟"

شاگرد : "جناب اس بادشاہ کو جس کے پاس تاج ہی نہ ہو اور وہ تخت پر بیٹھ جائے۔"

☆ --- ☆ --- ☆

ہدایت کار : (اداکار سے) "اب تمہیں کھڑکی سے تالاب میں کودنا ہوگا۔"

اداکار : "نہیں صاحب نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

ہدایت کار : "کیوں؟"

اداکار : "کیوں کہ میں تیرنا نہیں جانتا میں ڈوب جاؤں گا۔"

ہدایت کار : "کوئی حرج نہیں۔ یہ آخری سین ہے۔"

☆ --- ☆ --- ☆

ایک خاتون گھبرائی ہوئی ڈاکٹر کے پاس آئیں اور بولیں : "ڈاکٹر صاحب میرے کتے نے پیٹرول پی لیا ہے اور وہ صحن میں مسلسل چکر لگا رہا ہے۔"

ڈاکٹر نے اطمینان سے جواب دیا "فکر کی کوئی بات نہیں پیٹرول ختم ہو جائے گا تو خود ہی رک جائے گا۔"

☆ --- ☆ --- ☆

ماسٹر صاحب : "گڈو بتاؤ چینی و مصری زبان میں کیا فرق ہے؟"

گڈو : "جناب والا کوئی فرق نہیں، دونوں ہی میٹھی ہیں۔"

☆ --- ☆ --- ☆

شوہر نے بیوی کو خط لکھا۔ جب بیوی نے لکھائی دیکھی تو اسے ایک لفظ بھی سمجھ نہ آیا۔ وہ خط دوا فروش کے پاس لے گئی۔ اور کہا اسے پڑھ دو۔ کیمسٹ کافی غور کرنے کے بعد مختلف دوائیں دیتے ہوئے بولا "پچاس روپے۔"

مرسلہ : محمد عمر قریشی، اسلام آباد

☆ --- ☆ --- ☆

ایک آدمی کتاب ہاتھ میں لئے زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا دوسرے آدمی نے پوچھا "کیا کوئی مزیدار لطیفہ ہے؟" اس نے جواب دیا۔ "جی ہاں لکھا ہے ہنسنے سے خون بڑھتا ہے۔"

☆ --- ☆ --- ☆

ایک کنجوس آدمی نے اپنے ملازم سے خوش ہو کر کہا "جاؤ میں تمہیں انعام میں وہ بھینس دیتا ہوں جو پچھلے سال گم ہو گئی تھی۔"

کنجوس کی بیوی یکدم بولی : "کیا غضب کرتے ہیں۔ اگر بھینس مل گئی تو؟"

کنجوس نے فوراً" ملازم سے مخاطب ہو کر کہا : "چلو تمہیں بھینس نہیں ہم وہ گھوڑا دیتے ہیں جو دو سال قبل مرگیا تھا۔"

محمد شاہد جمعہ خان سانبھری، حیدر آباد

☆ --- ☆ --- ☆

ایک ڈاکٹر صاحب افریقہ کے جنگلوں میں چھٹیاں گزار کر لوٹے تو ان کے دوست نے شکار کے واقعات سنانے کی فرمائش کی۔ ڈاکٹر صاحب نے سرد آہ بھر کر کہا : "بڑی بوریت ہوئی کچھ بھی نہیں مار سکا بہتر تو یہی تھا کہ میں اسپتال ہی میں رہتا۔"

نعمان عزیز، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

ایک صاحب اپنے دوست سے ملنے پیدل گاؤں جا رہے تھے۔ راستے میں انہیں ایک بیل گاڑی نظر آئی تو انہوں نے بڑی خوش خلقی سے سوال کیا : "جناب میں پوچھ سکتا ہوں۔ آپ کی گاڑی کہاں جا رہی ہے؟" بیل گاڑی کے مالک نے جواب دیا : "جناب میں گاؤں جا رہا ہوں۔" وہ صاحب خوش ہو کر بولے : "تو کیا آپ مہربانی فرما کر میرا کوٹ اپنے ساتھ لے جائیں گے؟" سادہ لوح دیہاتی نے ہنستے ہوئے پوچھا : "مگر میں آپ کا کوٹ گاؤں میں دوں گا کس کو؟" وہ صاحب چونک کر بولے : "ہاں یہ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ چلیئے میں بھی کوٹ کے

ساتھ ہی بیٹھ جاتا ہوں تاکہ آپ کو تکلیف نہ ہو۔"

محمد رشید احمد' خانیوال

☆ --- ☆ --- ☆

سردار جی نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے اپنے نوکر سے یک لخت سوال کیا۔ "اوئے یہ بتاؤ ہم کس پر بیٹھے ہیں؟"

نوکر حیران پریشان سردار جی کو دیکھتے ہوئے بولا : "سردار جی! آپ گھوڑے پر بیٹھے ہیں؟ کیا آپ کو نہیں پتہ؟" سردار جی مسکراتے ہوئے بولے۔ "پتہ ہے پتہ ہے' پھر بھی چیک کر لینے میں کیا ہرج ہے۔"

محمد رشید احمد خانیوال

☆ --- ☆ --- ☆

گاہک : (دکان دار سے) "اس سوٹ کی کیا قیمت ہے؟"

دکاندار : "سو روپے"

گاہک : لاحول ولا قوۃ ..... اور اس سوٹ کی کیا قیمت ہے۔"

دکاندار : دو لاحول ولا قوۃ

مرسلہ : ایم کے نوح اللہ بورے والا

☆ --- ☆ --- ☆

وکیل نے مقدمے کی بحث کے دوران عدالت میں ملزم سے سوال کیا "اس نے تم سے کیا کہا تھا جس پر تم نے اسے بری طرح مارا پیٹا؟"

"وہ باتیں کسی شریف آدمی کے سامنے نہیں دہرائی جاسکتی ہیں۔" ملزم نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے" وکیل بولا۔ "تم وہ باتیں جج صاحب کے کان میں کہہ دو۔"

محمد شاہد' حیدر آباد

☆ --- ☆ --- ☆

اسکول ٹیچر نے استعفیٰ دینے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ "آج کل اسکول کے اساتذہ پرنسپل سے ڈرتے ہیں۔ پرنسپل اسکول کے سپرنٹنڈنٹ سے ڈرتے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ گورننگ باڈی سے ڈرتا ہے۔ گورننگ باڈی بچوں کے والدین سے ڈرتی ہے۔ والدین بچوں سے ڈرتے ہیں اور بچے کسی سے نہیں ڈرتے۔"

محمد شاہد' حیدر آباد

☆ --- ☆ --- ☆

پاگل خانے کے ڈاکٹر نے ایک پاگل کو خط لکھتے ہوئے دیکھا تو پوچھا "کسے خط لکھ رہے ہو؟"

پاگل نے جواب دیا "اپنے آپ کو۔"

ڈاکٹر بولے : "کیا لکھا ہے؟"

پاگل نے جواب دیا : "یہ اس وقت پتہ چلے گا جب خط مجھے ملے گا۔"

وعدہ پکا

الطاف حسین

بزدل دشمن، بدحواس گیدڑ کی طرح میدان چھوڑ کر بھاگ چکا تھا۔ اور پاک فوج کے بپھرے ہوئے شیر "جھوٹے" کو اس کے گھر تک پہنچانے کے لئے "ایڈوانس" کرتے ہوئے اس کے تعاقب میں تھے!! فضا جو کچھ دیر پہلے تک دل ہلادینے والے زور دار دھماکوں اور موت کی چیخوں سے گونج رہی تھی۔ اب قدرے پرسکون ہو چکی تھی۔ بارود کی ناگوار بو نے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ جلتے ٹینکوں سے اٹھتا دھواں ابھی تک دشمن کی بربادی کا ماتم کر رہا تھا۔ دشمن جاتے جاتے اپنے پیچھے بے شمار لاشے اور زخموں سے کراہتے کئی وجود بھی چھوڑ گیا تھا۔ ان سے کچھ فاصلے پر پاک فوج کے وہ جانباز مسکراتے چہروں کے ساتھ اپنے وطن کی خاک پر ابدی نیند سو رہے تھے۔ جنہوں نے اپنی مٹی سے کیا ہوا وعدہ نبھاتے ہوئے اپنا تن، من، دھن، سب کچھ

ہی دیس کی بقاء کی خاطر قربان کردیا تھا!!

☆ --- ☆ --- ☆

کیپٹن علی شیر چلتے چلتے ایک جگہ رک گئے۔ ان کی نظریں زمین پر جمی ہوئی تھیں۔

"یوں لگتا ہے جیسے کوئی' زخمی حالت میں لڑکھڑاتا ہوا آگے گیا ہے۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بولے اور پھر وہیں کھڑے کھڑے گروپ بی کے انچارج کو پکارا "اسلم ادھر آنا۔"

نرسنگ حوالدار اسلم ان کی آواز سن کر دوڑتا ہوا قریب آیا اور سیلوٹ کرتے بولا "کیا حکم ہے سر؟"

"اسلم آپ دو سپاہیوں کو ساتھ لے کر ان نشانات پر چلتے ہوئے آگے جاؤ ..... اور ..... زخمی کو اٹھا کر پیچھے لے آؤ۔"

"رائٹ سر!" اسلم نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر سیلوٹ کیا اور دوڑتا ہوا اپنے گروپ کی طرف بڑھا۔

☆ --- ☆ --- ☆

قدموں کے نشانات چند فرلانگ تک نظر آنے کے بعد گھنی جھاڑیوں کے نزدیک جاکر ختم ہوگئے تھے اور وہ تینوں ادھر ادھر نظریں دوڑا کر اگلا سرا تلاش کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ اچانک ایک گرجدار آواز نے ان کے پاؤں جکڑ لئے "خبردار ..... جہاں ہو وہیں رک جاؤ ..... ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔"

دوسرے ہی لمحہ انہیں جھاڑیوں سے مشین گن کی نالی باہر جھانکتی دکھائی دی۔ اور پھر للکارنے والا بھی لنگڑاتا ہوا ان کے سامنے آگیا۔

اس کا چہرہ گرد سے اٹا ہوا تھا۔ خاکی وردی جگہ جگہ سے پھٹ کر چیتھڑے بن چکی تھی۔ ایک گال پر زخم کا گہرا نشان تھا۔ جس سے بہنے والا خون ایک لکیر کی صورت میں اس کی ٹھوڑی تک آکر جم گیا تھا۔ داہنے گھٹنے سے بھی خون رس رس کر فیلڈ پٹی کو سرخ کررہا تھا۔

"ارے یہ تو اپنی فوج کا جوان ہے!!" اسلم اسے دیکھتے ہی خوشی سے چلایا ادھر زخمی سپاہی نے بھی میڈیکل کور کے عملہ کو پہچان لیا تھا۔ اور اب وہ مشین گن کا رخ نیچے کئے ان کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ خود ہی بولا۔

"میری پلٹن ایڈوانس کر چکی ہے ..... اور میں زخمی ہونے کی وجہ سے پیچھے رہ گیا ہوں ....." اس کے چہرے پر یکدم دکھ سمٹ آیا تھا "اور اب میں اپنی پلٹن سے ملنے جارہا ہوں .... لیکن تم .....؟"

"ہم تمہیں لینے آئے ہیں" اسلم اس کے قریب آگیا۔

"مگر کیوں؟"

"اس لئے کہ تم شدید زخمی ہو چکے ہو ..... ہم تمہیں ہسپتال لے جائیں گے اور وہاں تمہارا علاج ہوگا۔" اسلم نے وضاحت کی۔

"لیکن میں ..... میں تو پیچھے نہیں جاؤں گا ..... میں صرف آگے جاؤں گا ..... کیونکہ ..... ابھی میری گن میں گولیاں اور جسم میں جان باقی ہے ..... اور پھر میں نے اپنے ملک و قوم سے آخری سانس اور آخری گولی تک لڑنے کا وعدہ بھی تو کر رکھا ہے۔" سپاہی کے لہجے میں شدید زخمی ہونے کے باوجود بادلوں کی سی گھن گرج تھی۔

"دیکھو تمہارا کافی خون بہہ چکا ہے اگر بروقت علاج نہ کیا گیا تو تم مر بھی سکتے ہو۔"

"میں ..... مروں گا نہیں ..... سمجھے۔" وہ تینوں کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا "تم نے اگر اٹھانا ہی ہے تو کسی اور کو تلاش کرو اور اسے اٹھا کر پیچھے لے جاؤ ..... لیکن ..... لیکن خدا کے لئے میرا وقت برباد نہ کرو مجھے ایڈوانس کرنے دو ..... مجھے بہت دور جانا ہے۔"

☆ --- ☆ --- ☆

"جوان میں تمہارے جذبات کا بے حد احترام کرتا ہوں لیکن تمہاری حالت دیکھنے کے بعد میرا پیشہ مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ تمہیں آگے جانے دوں۔" کیپٹن علی شیر اپنے زخمی صف شکن کو سینے سے لگائے کہہ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں تیرتے آنسو اس حقیقت کے گواہ تھے کہ وہ سپاہی کے عزم سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔

"سر ابھی تو ....."

"ہاں مجھے پتہ ہے ابھی تمہاری مشین گن میں بہت سی گولیاں باقی ہیں لیکن اس حالت میں لڑتے ہوئے تم کئی گولیاں ضائع بھی کر سکتے ہو ..... اور صحت مند ہونے کی صورت میں تمہاری ہر گولی دشمن کے لئے موت کا پیغام ثابت ہوگی۔"

"سر اگر میں ہسپتال جاکر مر گیا تو اللہ کو کیا جواب دوں گا؟"

"تم مرو گے نہیں ..... انشاء اللہ تم زندہ رہو گے ..... اور دوبارہ اپنی پلٹن کے ساتھ مل کر لڑو گے۔ چلو شاباش اب اسٹریچر پر لیٹ جاؤ۔" کیپٹن علی شیر پیار سے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولے۔

سپاہی کی حالت تیزی سے بہتر ہو رہی تھی

○ انسان برسوں میں جوان ہوتا ہے لیکن اگر اپنے وقت کو بہترین طریقے سے استعمال کرے تو وہ گھنٹوں میں بوڑھا یعنی تجربہ کار ہو جاتا ہے۔

(فیثا غورس)

اور اس عمل میں اس کی مضبوط قوت ارادی اور حب الوطنی کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ کیپٹن علی شیر اس کے علاج پر بھرپور توجہ دے رہے تھے ان کی پوری کوشش تھی کہ وہ جلد از جلد صحت یاب ہو کر محاذ جنگ پر واپس چلا جائے۔

اور پھر چند روز بعد وہ اپنے پلٹن کمانڈر کے سامنے موجود تھا۔

"سر اب مجھے اجازت ہے؟"

"بالکل اجازت ہے ..... جاؤ اور دشمن کو بتادو کہ تم اس کے حملہ کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے پھر لوٹ آئے ہو۔"

"رائٹ سر" سپاہی نے دایاں ہاتھ زور سے اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑی مشین گن پر مارتے ہوئے فوجی سلام کیا اور پھرتی سے پیچھے مڑ کر تیز تیز چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اگلے لمحہ وہ میدان جنگ میں کود چکا تھا!

سپاہی کہاں تو زخمی ہونے کی وجہ سے پلٹن سے پیچھے رہ گیا تھا اور کہاں پلٹن کو اس کے عزائم کا ساتھ دیتے مشکل پیش آرہی تھی۔ اس کی بہادری اور سرفروشی نے دشمن کی کئی چوکیاں خالی کرالی تھیں۔ اور اب ایک انتہائی اہم چوکی اس کا نشانہ تھی۔ یہاں دشمن کی بہت بڑی تعداد تھی مگر سپاہی کا حوصلہ جوان تھا اس کے لڑنے کا انداز دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے جسم میں بجلیاں بھر دی گئی ہیں۔ وہ ایک جگہ سے دشمن کا نشانہ لے کر فائر کرتا اور پھر چیتے کی طرح جست لگا کر پلک جھپکتے میں دوسری طرف پہنچ جاتا تھا۔ جھنجھلائے ہوئے دشمن نے اب تک اس پر جتنی گولیاں بھی فائر کی تھیں ان میں سے ایک بھی نشانہ پر نہیں لگی تھی۔ ہر بار وہ اپنی تجربہ کاری اور حاضر دماغی کی وجہ سے بچ جاتا تھا ..... وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سپاہی کے پاس گولیاں کم ہوتی جارہی تھیں لیکن ادھر دشمن فوج کی لاشوں میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا!!! گویا اہم ترین چوکی خالی ہوتی جارہی تھی۔

ایک موقع پر سپاہی کو محسوس ہوا کہ وہ چاروں طرف سے دشمنوں میں گھر چکا ہے۔ لیکن وہ ذرا نہ گھبرایا..... نہ اس کے قدم ڈگمگائے۔ ..... وہ مردانہ وار مقابلہ پر ڈٹ گیا۔ دشمن کے سپاہی اس پر اندھا دھند گولیوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے لیکن وہ نہایت ہوشیاری سے اپنا دفاع

کرتے ہوئے انہیں منہ توڑ جواب دے رہا تھا ..... اور پھر سپاہی کی مشین گن میں صرف ایک گولی باقی رہ گئی! ..... اسی لمحے دشمن کی طرف سے کئی برسٹ فائر ہوئے ..... وہ زمین پر گر پڑا ..... اس کی خاکی وردی تیزی سے سرخ ہونے لگی ..... اس نے نظر بھر کر آسمان کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "ابھی تو میرا وعدہ پورا نہیں ہوا .....!"

سپاہی نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے واپس مڑتے ہوئے دشمن کو دیکھا اور اپنے جسم کی رہی سہی طاقت جمع کرنے لگا ..... اگلے لمحہ فضا میں "اللہ اکبر" کی پرجوش گونج سنائی دی پھر دھماکہ ہوا اور اس کے فوراً بعد ایک کریہہ چیخ ابھری۔ جو اس بات کا اعلان تھی کہ سپاہی کی آخری گولی نے ایک اور دشمن کو موت کے کنوئیں میں اتار دیا ہے!

"الحمدللہ" سپاہی کے منہ سے مسکراتے ہوئے نکلا۔ اور پھر اس کی گردن دوسری طرف ڈھلک گئی ..... وہ شہید ہوچکا تھا!..... لیکن آخری گولی اور آخری سانس تک لڑنے کا اپنا وعدہ نبھا گیا تھا!!!

مفرّح و مقوّی قلب ہے

معدہ اور دماغ کو

طاقت بخشتا ہے

احمد کا

مُربّہ گاجر

بینائی میں طاقت

ذائقہ اور غذائیت

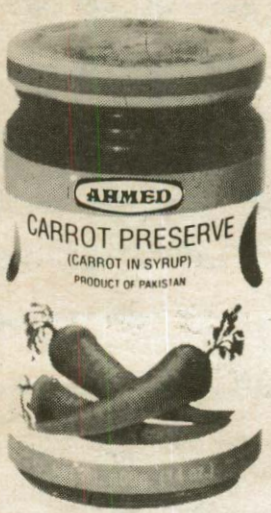

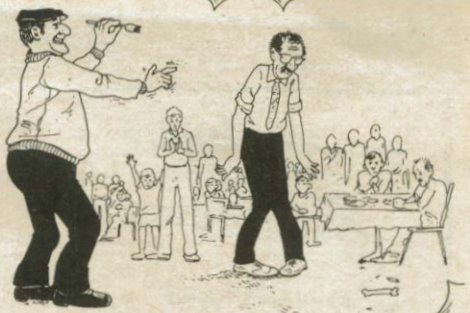

بازی گری

فضل حق

کسی گھر میں شادی کی تقریب تھی
بڑی شاندار اس میں دعوت اڑی

بہت پر تکلف تھے کھانے وہاں
تھے سارے ہی چاندی کے چمچے وہاں

پڑی ایک مہماں کی ان پر نظر
ہوا فرطِ لالچ سے منہ تر بتر

مہارت سے چمچے پہ قبضہ کیا
اسے اپنے پاپوش میں رکھ لیا

اسے دیکھا ایک اور مہمان نے
جو بیٹھا ہوا تھا وہیں سامنے

جگہ پر وہ اپنی کھڑا ہوگیا
وہ لوگوں سے پھر یوں مخاطب ہوا

تماشا دکھاؤں گا میں شان دار
یہ محفل رہے گی سدا یاد گار

یہ چمچہ ہے دیکھو اسے غور سے
ہے بازی گری میری اس طور سے

اسے جیب میں اپنی ڈالوں گا میں
کہیں اور سے پھر نکالوں گا میں

یہ دیکھو میری جیب میں اب گیا
یہ جوتے سے اس کے نکل آئے گا

اتارا جو پاپوش اس شخص کا
وہاں سے وہ چمچہ برآمد ہوا

تماشے سے سب کو مزا آگیا
بڑا شہر میں اس کا چرچا ہوا

وہ چالاک انساں ہوا بامراد
چرایا تھا جس نے گیا نامراد

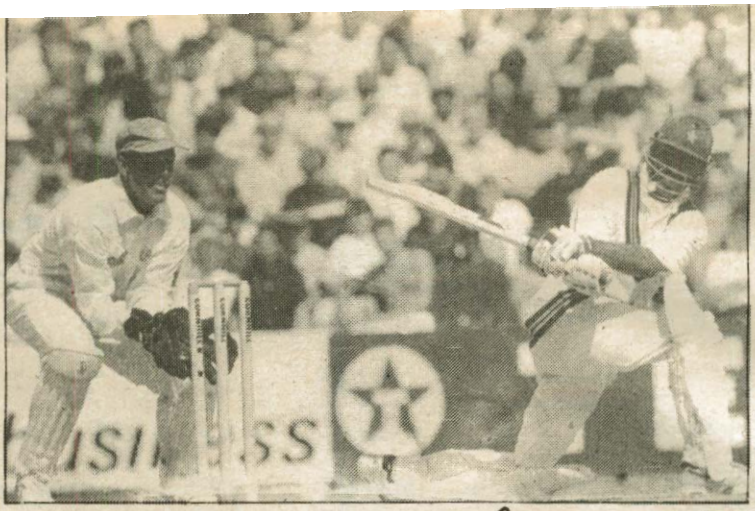

پاکستان بمقابلہ انگلینڈ

سید یحییٰ حسینی

گزشتہ ٹیسٹ سیریز کا مختصر ریکارڈ ایک نظر میں

پاکستان کی کرکٹ ٹیم انگلینڈ میں انگلینڈ کے خلاف ٹیسٹ سیریز کھیلنے کے لئے دسویں مرتبہ سر زمین انگلستان پر پہنچ چکی ہے۔ ۱۹۸۷ء اور ۱۹۹۲ء کے کامیاب دوروں کی طرح اس بار بھی ہماری ٹیم نے انگلستان کو شکست دے دی ہے۔۔ زیر نظر مضمون میں ہم دونوں ٹیموں کے درمیان کھیلے گئے میچز کے اعداد و شمار دے رہے ہیں۔

پاکستان بمقابلہ اِنگلینڈ

سیزن	بمقام	انگلش کپتان	پاکستانی کپتان	ٹیسٹ	انگلینڈ جیتا	پاکستان جیتا	برابر
۱۹۵۴ء	انگلینڈ	لین ہٹن	عبدالحفیظ کاردار	۴	۱	۱	۲

۶۲-۱۹۶۱ء	پاکستان	ٹیڈ ڈیکسٹر	امتیاز احمد	۳	۱	۲
۱۹۶۲ء	انگلینڈ	ٹیڈ ڈیکسٹر	جاوید برکی	۵	۴	۱
۱۹۶۷ء	انگلینڈ	برائن کلوز	حنیف محمد	۳	۲	۱
۶۹-۱۹۶۸ء	پاکستان	کالن کاؤڈرے	سعید احمد	۳	۳	
۱۹۷۱ء	انگلینڈ	رے النگورتھ	انتخاب عالم	۳	۱	۲
۷۳-۱۹۷۲ء	پاکستان	ٹونی لوئیس	ماجد خان	۳	۳	
۱۹۷۴ء	انگلینڈ	مائیک ڈینس	انتخاب عالم	۳		۳
۷۸-۱۹۷۷ء	پاکستان	مائیک برئیرلی	وسیم باری	۳	۲	۱
۱۹۷۸ء	انگلینڈ	مائیک برئیرلی	وسیم باری	۳	۲	۱
۱۹۸۲ء	انگلینڈ	باب ولس	عمران خان	۳	۲	۱
۸۴-۱۹۸۳ء	پاکستان	ڈیوڈ گاور	ظہیر عباس	۳	۱	۲
۱۹۸۷ء	مائیک گیٹنگ		عمران خان	۵	۱	۴
۸۸-۱۹۸۷ء	پاکستان	مائیک گیٹنگ	جاوید میانداد		۳	۱
۱۹۹۲ء	انگلینڈ	گراہم گوچ	جاوید میانداد	۵	۲	۲
		انگلینڈ میں کھیلے گئے ٹیسٹ		۳۴	۱۳	۵	۱۶
		پاکستان میں کھیلے گئے ٹیسٹ		۱۸	۱	۲	۱۵
		مجموعی کارکردگی		۵۲	۱۴	۷	۳۱

اِننگز کا زیادہ سے زیادہ اسکور :

پاکستان	انگلینڈ میں	۷۰۸	اوول	۱۹۸۷ء
	پاکستان میں	۵۶۹-۹	حیدر آباد	۷۳-۱۹۷۲ء
انگلینڈ	انگلینڈ میں	۵۵۸-۶	ٹرینٹ برج	۱۹۵۴ء
	پاکستان میں	۵۴۶-۸	فیصل آباد	۸۴-۱۹۸۳ء

مکمل اننگز کا کم از کم اسکور :

پاکستان	اِنگلینڈ میں	۸۷	لارڈز	۱۹۵۴ء
	پاکستان میں	۹۱	فیصل آباد	۸۸-۱۹۸۷ء
اِنگلینڈ	اِنگلینڈ میں	۹۹	ہیڈنگلے	۱۹۹۲ء
	پاکستان میں	۱۳۰	لاہور	۸۸-۱۹۸۷ء

بہترین انفرادی اِننگز :

پاکستان	انگلینڈ میں	۲۷۴	ظہیر عباس	ایجبسٹن ۱۹۷۱ء
	پاکستان میں	۱۵۷	مشتاق محمد	حیدر آباد ۷۳-۱۹۷۲ء
انگلینڈ	انگلینڈ میں	۲۷۸	ڈینس کامپٹن	ٹرینٹ برج ۱۹۵۴ء
	پاکستان میں	۲۰۵	ٹیڈ ڈیکسٹر	کراچی ۶۲-۱۹۶۱ء

سیریز میں زیادہ سے زیادہ مجموعی اسکور :

پاکستان	انگلینڈ میں	۴۸۸ (۸۱.۳۳)	سلیم ملک	۱۹۹۲ء
	پاکستان میں	۴۰۷ (۶۷.۸۹)	حنیف محمد	۶۲-۱۹۶۱ء
انگلینڈ	انگلینڈ میں	۴۵۳ (۹۰.۶۰)	ڈینس کامپٹن	۱۹۵۴ء
	پاکستان میں	۴۴۹ (۱۱۲.۲۵)	ڈیوڈ گاور	۸۴-۱۹۸۳ء

سینچریاں :

پاکستان : ۳۳ سینچریاں، انگلینڈ : ۴۴ سینچریاں

زیادہ سے زیادہ انفرادی سینچریاں :

پاکستان : (۳) جاوید برکی، آصف اقبال، حنیف محمد، مشتاق محمد، مدثر نذر، سلیم ملک

انگلینڈ : (۴)، پیٹر پارفٹ، کین بیرنگٹن

دونوں اننگز میں سینچریاں :

۱۱۱، اور ۱۰۴، حنیف محمد (پاکستان) ڈھاکہ ۶۲-۱۹۶۱

بہترین انفرادی بالنگ :

پاکستان	پاکستان میں	۹/۵۶	عبدالقادر	لاہور	۸۸-۱۹۸۷ء
	انگلینڈ میں	۷/۴۰	عمران خان	ہیڈنگلے	۱۹۸۷ء
انگلینڈ	انگلینڈ میں	۸/۳۴	ایان بوتھم	لارڈز	۱۹۷۸ء
	پاکستان میں	۷/۶۶	فل ایڈمنڈز	کراچی	۷۸-۱۹۷۷

میچ کی بہترین بالنگ :

پاکستان	پاکستان میں	۱۳/۱۰۱	عبدالقادر	لاہور	۸۸-۱۹۸۷ء
	انگلینڈ میں	۱۲/۹۹	فضل محمود	اوول	۱۹۵۴ء
انگلینڈ	انگلینڈ میں	۱۳/۷۱	ڈیرک انڈرووڈ	لارڈز	۱۹۷۴ء
	پاکستان میں	۱۱/۸۳	نک کک	کراچی	۸۴-۱۹۸۳ء

سیریز میں بہترین کارکردگی :

پاکستان	انگلینڈ میں	۲۲ وکٹیں	وقار یونس	۱۹۹۲ء
″	پاکستان میں	۳۰ وکٹیں	عبدالقادر	۸۸-۱۹۸۷ء
انگلینڈ	انگلینڈ میں	۲۲ وکٹیں	فریڈی ٹرومین	۱۹۶۲ء
″	پاکستان میں	۱۶ وکٹیں	نک کک	۸۴-۱۹۸۳ء

میں کیوں رو رہا تھا

جدون ادیب

بڑے بھائی رو رہے تھے، امی رو رہی تھیں اور میں رو رہا تھا!

سامنے ایک عجیب طرز کی چارپائی پر ابو لیٹے ہوئے تھے۔ سفید چادر سے ان کا جسم ڈھکا ہوا تھا صرف چہرہ نظر آرہا تھا۔

میں نہیں جانتا کہ میں کیوں رو رہا تھا مگر بڑے بھائی رو رہے تھے امی رو رہی تھیں اِس لئے میں بھی رو رہا تھا۔

بعض اوقات انسان کو یہ نہیں پتہ ہوتا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ لیکن اگر اس کو پتہ چل جائے کہ وہ کیوں رو رہا ہے تو وہ اور روئے.....!

بس میں روئے جارہا تھا۔

بڑے بھائی روتے روتے میری طرف بڑھے، کھینچ کر مجھے اپنے سینے سے لگایا اور بھرائے ہوئے لہجے میں بولے "چھوٹے بھائی! بس چپ ہو جاؤ صبر کرو.....!"

میں چپ ہوگیا میں نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

بڑے بھائی مجھے ہمیشہ منا کہہ کر بلاتے تھے مگر جب "چھوٹے بھائی" کہہ کر بلاتے میں سمجھ جاتا کہ بھائی بہت اداس ہیں' بہت دکھی ہیں اس لئے جب وہ مجھے چھوٹے بھائی ________ کہہ کر کچھ کہتے تھے تو میں ان کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔

جب پہلی دفعہ پانچویں جماعت میں میں نے اسکول بھر میں اول پوزیشن حاصل کی تو بڑے بھائی خوشی سے جیسے پاگل ہوگئے۔ دیوانہ وار انہوں نے مجھے چومنا شروع کردیا وہ ہنس رہے تھے خوشی سے چلا رہے تھے مگر ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے!

پھر وہ دیوار پر آویزاں ابو کی تصویر کی طرف بڑھے اور خود کلامی کے انداز میں بولے "ابو دیکھیں ہمارا منا پورے اسکول میں پہلے نمبر پر آیا ہے میں آپ کی خواہش کے مطابق منا کو ایک بڑا ڈاکٹر بناؤں گا اتنا بڑا اور اچھا ڈاکٹر کہ اس جیسا کوئی نہ ہوگا ..... وہ آپریشن کرنے کے منہ مانگے پیسہ نہیں لیا کرے گا ..... اس کی وجہ سے کسی کا باپ نہیں مرے گا ..... ہاں کسی کا باپ نہیں مرے گا ....." سسکیاں بھرتے ہوئے انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا : "منا! تم ایک اچھے ڈاکٹر بنو گے نا.....!"

میں چپ رہا کیونکہ میں پائیلٹ بننا چاہتا تھا۔

بڑے بھائی پھر بولے "بولو منا! ڈاکٹر بنو گے نا!"

میں چپ رہا!

بڑے بھائی اداس ہو کر بولے "بولو نا! چھوٹے بھائی ڈاکٹر بنو گے نا!"

میں نے اثبات میں سر ہلادیا اور بھاگ کر بڑے بھائی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا

☆ --- ☆ --- ☆

"بڑے بھائی! میں یہ جہاز لوں گا!"

بڑے بھائی نے میری انگلی کی سمت دیکھا' شوکیس میں شیشے کا خوبصورت' نفیس اور بڑا سا جہاز رکھا ہوا تھا جس پر (RS : 2000) کا لیبل گویا کہ غریبوں کا مذاق اڑا رہا تھا .....! بڑے بھائی نے چند لمحے سوچا ان کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا پھر ان کے چہرے پر ہمت و عزم اور محبت کا عجیب سا عکس نمودار ہوگیا اور مسکرا کر بولے "منا! ٹھیک بیس دن بعد یہ جہاز تمہارا ہوگا ٹھیک ہے نا!"

میں نے خوشی سے سر ہلادیا۔

"بڑے بھائی اپنا وعدہ ضرور نبھائیں گے......"

اتنا تو میں جانتا ہی تھا.......!

بڑے بھائی اب روزانہ رات گئے گھر آنے

لگے اور چند گھنٹے سونے کے بعد فجر کی نماز پڑھ کر کام پر چلے جاتے۔ میں نے کئی دفعہ ان سے پوچھا کہ دیر سے کیوں گھر آتے ہیں۔ جبکہ ان کا بائنڈنگ کا کارخانہ جس میں وہ کام کرتے تھے رات آٹھ بجے تک بند ہو جاتا تھا مگر بڑے بھائی ہمیشہ ٹال جاتے!

یہی سوال میں نے ماں سے کیا تو وہ عجیب سے لہجے میں بولیں

"زخم لگا کر پوچھتے ہو درد کہاں ہو رہا ہے؟"

"میں سمجھا نہیں!" میں نے حیرت سے کہا۔

اسی لمحہ بڑے بھائی گھر میں داخل ہوئے اور دروزاے سے ہی چلا کر بولے "منا! یہ دیکھو تمہارا جہاز!"

میں حیرت و خوشی سے اچھل پڑا۔ بیس دن پورے ہو چکے تھے!

میں بھاگتا ہوا ان کے پاس گیا اور ان کے ہاتھ سے جہاز جھپٹا اور خوشی سے ناچنے لگا

بڑے بھائی مسکراتی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

بڑے بھائی بہت خوش تھے۔ ماں بھی خوش تھیں اور میری خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔

مگر..... چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی اکثر اپنے اندر کتنے غم چھپائے رہتی ہیں اس کا مجھے شعور نہ تھا۔

رات کو ہی خوش دکھائی دینے والے بڑے بھائی کراہ رہے تھے۔ دبی دبی چیخیں ان کے منہ سے نکل رہی تھیں ماں ان کے ہاتھوں پر گرم کیا ہوا تیل لگا رہی تھیں اور بڑے بھائی کراہتے ہوئے کہہ رہے تھے "بس ماں بس! یہ ظالم کھدائی کا کام ہی ایسا تھا.....!"

☆ --- ☆ --- ☆

اسکول سے چھٹی ہوئی اور دوستوں کے ساتھ خوامخواہ کی آوارہ گردی میں پورے دو گھنٹے گزر گئے وقت کا احساس ماں اور بڑے بھائی کی پریشان شکلیں دیکھ کر ہوا۔

بڑے بھائی نے زندگی میں پہلی دفعہ مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا اور میں گم صم آنکھوں میں آنسو لئے ایک ہاتھ گال پر رکھے ان کو دیکھ رہا تھا۔

پھر میری آنکھوں سے آنسو لڑھک کر گال پر بہنے لگے تو بڑے بھائی دیوانہ وار اپنا ہاتھ دیوار پر مارنے لگے۔ پھر وہ میری طرف لپکے ان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

میں تیزی سے مڑا۔ جہاز اٹھا کر لایا اور زور سے فرش پر دے مارا۔ چھنک کی آواز آئی اور شیشے کا جہاز ٹوٹ گیا۔

بڑے بھائی دم بخود رہ گئے ان کی آنکھوں

چاکلیٹ تتلی

جنوبی امریکہ کے ملک برازیل میں ایک عجیب و غریب تتلی پائی جاتی ہے۔ یہ تتلی دیکھنے میں خوبصورت ہوتی ہے اس کا رنگ چاکلیٹی ہوتا ہے خوبی یہ ہے کہ تتلی میں سے چاکلیٹ کی خوشبو آتی ہے۔

میں حیرت و دکھ کے تاثرات منجمد ہو کر رہ گئے پھر وہ جھکے اور ٹوٹے ہوئے جہاز کی کرچیاں ہاتھوں میں اٹھا کر ان کو دیکھتے ہوئے بڑبڑانے والے انداز میں بولے "منا! یہ تم نے کیا کردیا!"

انہوں نے اپنے ہاتھ سختی سے بند کر لئے شیشے کی کرچیاں ان کے ہاتھوں میں دھنس گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے ہاتھ لال ہوگئے اور خون کے قطرے زمین پر گرنے لگے۔

میں نے دوڑ کے ان کے ہاتھ تھام لیے اور ان کے ہاتھوں میں چبھی کرچیاں نکالنے لگا ان کے ہاتھوں سے خون نکل رہا تھا مگر بڑے بڑے چھالے مجھے نظر آرہے تھے جو ایک ادھوری کہانی کو مکمل کررہے تھے ایک راز چیخ چیخ کر بتا رہے تھے.....!

میں رو دیا۔ "بڑے بھائی یہ آپ نے کیا کردیا!"

وہ گلوگیر لہجے میں بولے "یہ جہاز نہیں میرا دل تھا جو تم نے ٹکڑے ٹکڑے کردیا ہاں چھوٹے بھائی یہ میرا دل تھا.....!"

یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے!

وہ بھی رو رہے تھے اور میں بھی رو رہا تھا!

ان کو تو پتہ تھا کہ وہ کیوں رو رہے ہیں لیکن اب میں بھی جانتا تھا کہ میں کیوں رو رہا ہوں یہی وجہ ہے کہ آنسو بہے جارہے تھے۔ میں رو رہا تھا میں اتنا روتا' اتنا روتا کہ میرا کلیجہ پھٹ جاتا!

اچانک بڑے بھائی نے سر اٹھایا۔

"منا!" وہ بولے انہوں نے بند مٹھی میرے آگے کردی۔ "منا اب تو بڑا ہو جا۔ دیکھ میں اس مٹھی کو نہیں کھولوں گا۔ تھپڑ بننے کے لئے یہ مٹھی کبھی نہیں کھلے گی۔ بس تو بڑا ہوجا۔ منا تو بڑا ہوجا۔"

میرے آنسو اچانک رک گئے۔ میں نے بھیگی آنکھوں سے بڑے بھائی کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر دکھ تھا۔ افسوس تھا اور حسرت بھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں صاف کرلیں۔ اب میں یہ بھی جان گیا تھا کہ میرے آنسو کیوں رک گئے ہیں۔ میں جھپٹ کر بڑے بھائی کے گلے لگ گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میرا قد بڑھ گیا ہو اور میری عمر میں کئی سال کا اضافہ ہوگیا ہو۔

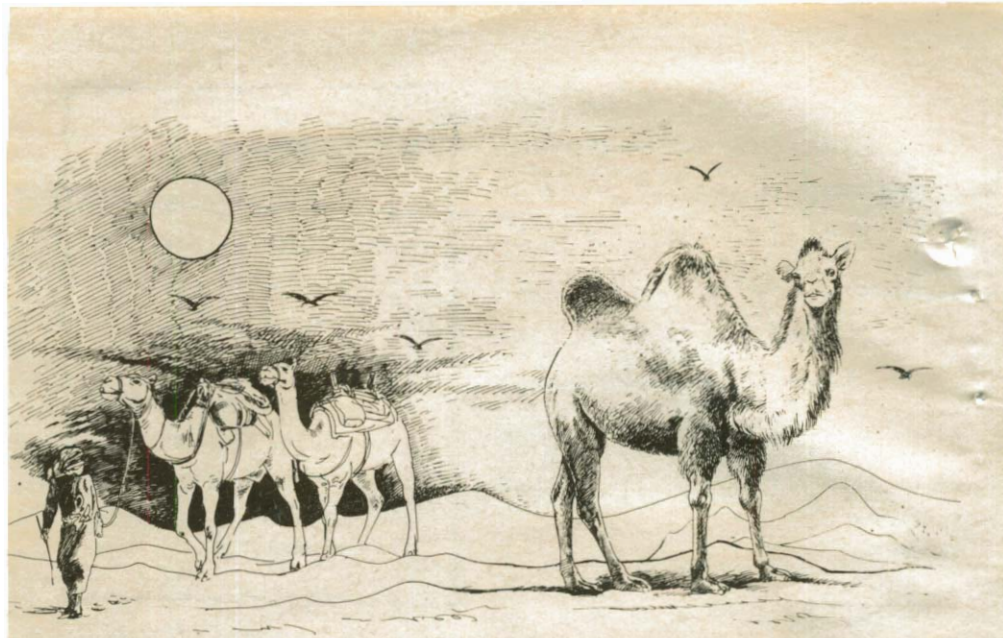

اونٹ

مسعود حسن رضوی ادیب

اونٹ بھی عجیب جانور ہے۔ چھوٹا سا سر، ذرا ذرا سے کان، بڑی لمبی ٹیڑھی گردن، تھوتھن لٹکا ہوا۔ پیٹھ پر کوہان، چھوٹی سی دم، پتلی پتلی لمبی لمبی ٹانگیں غرض کہ کوئی عضو درست نہیں۔ اسی لئے لوگوں میں ایک مثل مشہور ہو گئی ہے کہ "اونٹ رے اونٹ، تیری کون کل سیدھی"۔

دیکھنے میں تو اونٹ کچھ خوب صورت نہیں ہوتا مگر بڑا سیدھا، نہایت محنتی اور بڑے کام کا جانور ہے۔ منوں اسباب لادے ہوئے دور دور چلا جاتا ہے۔ سواری کا کام بھی دیتا ہے۔ بعض اونٹ اتنے تیز چلتے ہیں اور ایسے محنتی ہوتے ہیں کہ ایک ایک دن میں سو سو کوس چلے جاتے ہیں۔ اس قسم کے اونٹ کو سانڈنی کہتے ہیں۔ اور اس کی قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اگلے زمانے میں جب ہندوستان میں ریلیں نہ تھیں تو بادشاہ اپنے جاسوسوں کو سانڈنیاں دیتے تھے۔ یہ جاسوس انہیں

حیرت انگیز

۱) ستمبر ۱۹۷۴ء میں آسٹریا میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کا ایک موضوع "دل کے دورے اور ان کے سدباب" بھی تھا۔ ۶۶ سالہ ڈاکٹر جوزف جو امراض قلب کے ماہر بھی تھے دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ ان پر دل کا دورہ اس وقت پڑا جب وہ اس موضوع پر خطاب کر رہے تھے۔

۲) پولینڈ کی ملکہ ایبل ہارڈین وہ واحد ملکہ ہے جس نے پولینڈ کی سرزمین پر پچاس سال حکومت کی لیکن اس نے پولینڈ کی سرزمین پر قدم نہیں رکھا۔

مرسلہ ... سائرہ چوہدری۔ کراچی۔

سانڈنیوں پر سوار ہو کر دور دور کی خبریں آنا فانا لے آتے تھے۔

عرب کے ریگستانوں میں جہاں ہر جانور کے پیر ریت میں دھنس جاتے ہیں اور منزلوں پانی نہیں ملتا۔ وہاں اونٹ کے بغیر کام ہی نہیں چل سکتا۔ خدا نے اس جانور کو خاص کر ریگستانوں ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس کے پیروں کی بناوٹ سب جانوروں سے الگ ہوتی ہے۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ گھوڑے کے سُم اور گائے، بیل، بھینس کے کُھر بہت سخت ہوتے ہیں۔ یہ جانور جب چلتے ہیں تو زمین پر ان کے پیروں کے گہرے گہرے نشان بن جاتے ہیں۔ مگر اونٹ کے پیر سخت نہیں ہوتے۔ اس کے پیروں میں گوشت کی نہایت نرم گول گول گدیاں سی لگی ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے اونٹ کے پیر ریت میں نہیں دھنستے۔

ریگستان ان بڑے بڑے میدانوں کو کہتے ہیں جہاں سیکڑوں کوس تک ریت ہی ریت ہوتی ہے۔ نہ کہیں پانی کا چشمہ، نہ کوئی دریا، نہ کہیں گھاس کا پتا، نہ درخت کا نشان۔ ایسے میدانوں میں بغیر چارے پانی کے کوئی جانور کیونکر جی سکتا ہے؟ مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ اس نے اونٹ کے پیٹ میں ایک تھیلی بنا دی ہے۔ پانی پیتے وقت اونٹ اس تھیلی کو بھر لیتا ہے۔ اس لئے اس کو کئی کئی دن پیاس نہیں لگتی۔

یہ جانور کئی کئی دن بھوکا بھی رہ سکتا ہے۔ اس کی پیٹھ پر جو کوہان ہوتا ہے وہ اصل میں چربی کا ایک پنڈا ہے۔ جب اونٹ کو کئی کئی دن چارا نہیں ملتا تو یہی چربی پگھل پگھل کر پیٹ میں جاتی ہے اور غذا کا کام دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اونٹ بڑے بڑے بوجھ لادے ہوئے بے کچھ کھائے پئے منزلوں چلا جاتا ہے۔

عرب میں اونٹ کی بڑی قدر ہوتی ہے۔ مسافر اس پر سوار ہو کر دور دور کا سفر کرتے ہیں اور سوداگر تجارت کا مال لاد کر سیکڑوں کوس کے فاصلے پر لے جاتے ہی۔ اسی لئے لوگ اونٹ کو "ریگستان کا جہاز" کہتے ہیں۔ اگر تم عرب کے ملک میں جاؤ تو تم کو مسافروں اور سوداگروں کے اونٹوں کی بڑی بڑی قطاریں اکثر دکھائی دیں گی۔

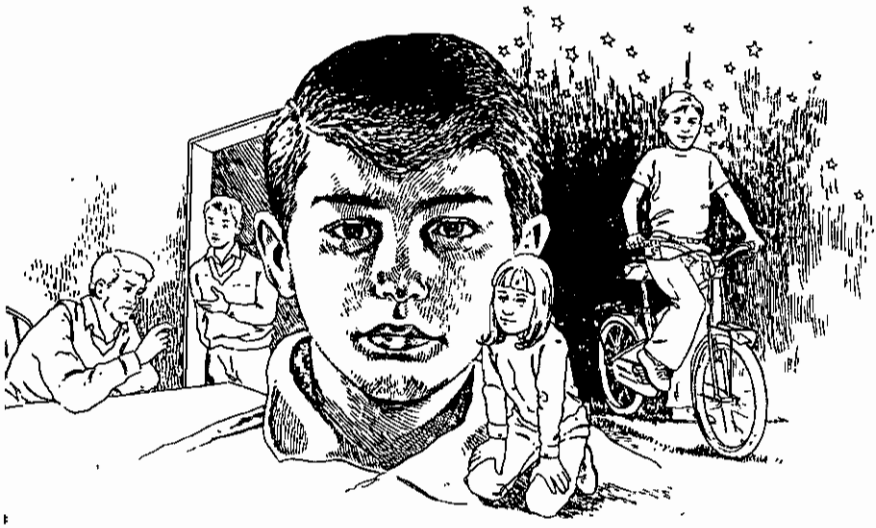

محبت کا رنگ

محمد طیب

فرحان کے اسکول کی وین گیٹ پر آکر رکی۔ اس کی آواز سنتے ہی منی گھبرا کر اٹھی۔ "آ گئے بھائی جان۔" اس نے جیسے خطرے کی گھنٹی بجائی اور جلدی جلدی اپنی گڑیاں سمیٹنے لگی۔ ذیشان جو چند لمحے پہلے مزے سے سائیکل چلا رہا تھا۔ جھٹ اسے ایک طرف کھڑی کر کے پودوں کو دیکھنے لگا۔

گیٹ کھلا اور فرحان اندر داخل ہوا۔ آنکھیں سکڑی ہوئی، تیوریوں پر بل، چہرے پر غصے اور بیزاری کے اثرات کھٹ کھٹ کرتا وہ سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور زور دار آواز سے دروازہ بند ہو گیا۔

یہ بات آج کی نہیں بلکہ فرحان کی عادت ہمیشہ سے ہی ایسی تھی۔ وہ پانچ سال کے انتظار اور دعاؤں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اور مزید تین سال تک اکلوتا رہ کر امی ابو کا پیار سمیٹتا رہا تھا۔

آندھی اور طوفان ٹل سکتے تھے۔ مگر اس کا کہا نہیں ٹلتا تھا۔ وہ اس گھر کا بے تاج بادشاہ تھا۔ اتنا بہت سا پیار پا کر اس میں غرور اور خود غرضی پیدا ہو گئی تھی۔ اور جب امی' ابو کی توجہ قدرتی طور پر چھوٹے بچوں کی طرف بٹ گئی تو فرحان جھنجلا گیا اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے علاوہ کوئی اور بھی پیار کے قابل ہے۔ اپنی برتری ظاہر کرنے کے لئے وہ چھوٹے بہن بھائی پر رعب جمانے لگا' بات بات پر انہیں ڈانٹتا اور کبھی کبھار تو پیٹ بھی ڈالتا۔ ظاہر ہے کہ ماں باپ کو اسے ٹوکنا ہی تھا۔ پہلے نرمی اور پھر سختی سے سمجھانے کی کوشش کی گئی تو اسے بے حد ناگوار گزرا۔ وہ دل ہی دل میں سب سے خفا رہنے لگا۔ خاص کر ذیشان اور منی سے تو اسے بہت ہی چڑ تھی چنانچہ وہ دونوں بھی اس سے بہت خوف زدہ رہتے اور اس کے آتے ہی ادھر ادھر ہو جاتے۔

ابو دفتر سے لوٹتے تو ذیشان بھاگ کر ان کی چپلیں لے آتا منی جلدی سے ان کے اتارے ہوئے بوٹ اپنی جگہ رکھ آتی۔ پھر وہ دونوں ابو کے دائیں بائیں بیٹھ کر میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگتے۔ فرحان دور بیٹھا یہ تماشا دیکھتا رہتا۔ کبھی ابو خود ہی اسے مخاطب کرتے تو الٹا سیدھا جواب دے کر منہ پھیر لیتا۔ اس سے اس کا مقصد یہ ہوتا کہ ابو خود اس کے پاس آئیں' اسے پیار کریں' اسے منائیں۔ صرف اس کے لئے چیزیں لے کر آئیں۔ وہ جس قدر ایسا سوچتا اسے اتنا ہی ذیشان اور منی پر غصہ آتا کبھی کوئی پستول' کہانی کی کتاب' گیند یا بلا آتا تو سب کا سب فرحان کے خزانے میں جمع ہو جاتا۔ ابو کہتے کہ "یہ تم دونوں بھائیوں کے لئے ہے مل کر کھیلنا" مگر فرحان کبھی ذیشان کو ہاتھ لگانے کا موقع ہی نہ دیتا۔ ذیشان تھا بھی بڑا صابر بچہ اس نے کبھی کوئی جھگڑا کیا اور نہ شکایت' اس کے لئے تو بس وہ آدھ گھنٹہ ہی غنیمت تھا جب وہ فرحان سے پہلے گھر آتا اور جلدی جلدی سائیکل چلا لیتا۔ رہی منی تو وہ اپنی انہی دو تین گڑیوں میں مگن تھی جو کئی سال سے اس کی ساتھی بنی ہوئی تھیں۔

چھٹی کا دن تو فرحان کے لئے اور بھی مصیبت بن جاتا۔ وہ بیزار بیزار ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چکر لگاتا پھرتا۔ صحن سے ابو امی اور ذیشان اور منی کے قہقہے سنائی دیتے وہ سب اسے بھی بلاتے مگر فرحان کبھی ان کے کھیل میں شریک نہ ہوتا۔ وہ چھپ چھپ کر سب کو دیکھتا اور حسرت سے سوچتا۔ "یہ سب لوگ آخر اتنے خوش کس طرح رہتے ہیں! آخر میں ان سب کی طرح خوش و خرم کیوں نہیں رہتا" یہ سوچیں اسے الجھا کر رکھ دیتیں۔ جب اسے اپنے

سوالوں کا جواب نہ ملتا تو وہ اور پریشان ہو جاتا۔

ایک دن فرحان کے اسکول سے خط آیا۔اس کی کلاس ٹیچر نے امی کو بلایا تھا۔ وہ اسکول گئیں تو مس نے دیکھتے ہی انہیں شکایت کی "دیکھئے محترمہ یہ آپ کا لڑکا ہر کسی سے خواہ مخواہ لڑتا رہتا ہے۔ سمجھانے کے باوجود باز نہیں آتا۔ میں نے تنگ آکر آپ کو زحمت دی ہے۔ ویسے یہ پڑھائی میں بہت اچھا ہے لیکن اس کی ان حرکتوں کے باعث مجھے افسوس ہوگا اگر اس کا نام اسکول سے خارج کرنا پڑا۔" امی کا سر شرمندگی سے جھک گیا۔ وہ ایک اداس نظر بیٹے پر ڈالتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔فرحان کا خیال تھا کہ آج لازمی طور پر گھر میں پٹائی ہوگی۔ یہی سوچتا ہوا جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اسے بڑی حیرت ہوئی جب معاملہ بالکل برعکس نکلا۔ امی نے نہ ہی اسے ڈانٹا اور نہ ابو سے شکایت کی۔ لیکن وہ بہت دکھی لگ رہی تھیں۔ ابو کے بار بار پوچھنے پر بھی انہوں نے اپنی اداسی کی وجہ نہ بتائی۔ بس سر درد کا بہانہ کرتی رہیں۔فرحان خود کو امی کی اس حالت کا ذمہ دار سمجھ رہا تھا اور اپنی حرکتوں پر شرمندہ بھی تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنی اس حالت کو بہتر کیسے بنائے۔ کس طرح سب لوگ اس کی تعریف کریں۔ اس کے بھی ڈھیر سارے دوست ہوں۔"شاید میری قسمت ہی خراب ہے۔" تھک ہار کر اس نے سوچا۔

دوسرے دن جمعہ تھا۔ صبح ناشتے کی میز پر اس نے دیکھا کہ آج امی کے ساتھ ساتھ ابو بھی غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہیں۔ شاید امی نے انہیں اسکول کی رپورٹ کے متعلق بتادیا ہو۔ فرحان کو بڑی ندامت ہوئی۔اسے ٹیچر اور اپنے ہم جماعتوں پر بھی غصہ آیا جنہوں نے شکایت کر کے اسے امی' ابو کے سامنے شرمندہ کرادیا تھا۔ ابو نے ناشتے کے بعد میز سے اٹھتے ہوئے اسے اپنے کمرے میں آنے کے لئے کہا۔ فرحان سمجھ گیا کہ جو کچھ اس کے ساتھ کل نہ ہوسکا وہ آج ہونے والا ہے۔ وہ زور زور سے پاؤں پٹختا ابو کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔ خلاف توقع ابو نے بڑی نرمی سے اسے اپنے ساتھ بٹھایا اور دھیمی آواز میں سوال کیا۔

"فرحان! کیا یہ درست ہے کہ تم اسکول میں اپنے ساتھیوں کو مارتے ہو؟"

ان کی نرمی نے فرحان کا حوصلہ بڑھایا۔ وہ بے جھجک بولا

"جی ہاں ابو! اس لئے کہ وہ سب میرے دشمن ہیں' کوئی بھی میرے ساتھ نہیں کھیلتا۔"

"تم نے کبھی سوچا بیٹے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟" ابو نے پوچھا "بہت ٹھنڈے دل کے ساتھ تم اپنے رویے پر غور کرو' ایسا تو نہیں کہ کھیل کے

دوران تم اپنی بات منوانا چاہتے ہو' دوسروں کی تعریف یا کامیابی تمہیں پریشان کردے اور تم انہیں مبارکباد دینے کے بجائے ذلیل کرنا چاہتے ہو!" فرحان کو یوں لگا جیسے ابو کلاس یا کھیل کے میدان میں چھپ چھپ کر اسے دیکھتے رہے ہوں کیوں کہ یہ سب باتیں سچ تھیں۔

اسے چپ دیکھ کر ابو نے جواب پر اصرار نہیں کیا وہ اسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ پھر وہ پوچھنے لگے' "اچھا یہ تو بتاؤ کہ تمہیں اپنے بہن بھائی اچھے لگتے ہیں؟"

"جی! کبھی کبھی اچھے لگتے ہیں۔" فرحان نے جواب دیا۔

"کب؟" ابو نے دوسرا سوال کیا۔ "ان کی کونسی عادت تمہیں اچھی لگتی ہے؟"

"جب وہ میرا حکم مانتے ہیں۔ جب میرا کام کرتے ہیں۔"

"لیکن یہ تو محبت کا ایک ہی رخ ہوا نا بیٹے" ابو نے پیار سے کہا "کہ بس وہ تمہارے کام کرتے رہیں تو تم انہیں اچھا سمجھو' کیا ان کا دل نہیں چاہتا ہوگا کہ تم بھی کبھی کبھی ان کی مدد کرو۔"

"لیکن ابو وہ تو مجھ سے کچھ کہتے ہی نہیں۔"

"اس لئے کہ انہیں تم سے امید ہی نہیں کہ تم کبھی ان کی بات مانو گے۔"

"لیکن میں کیا کروں ابو مجھ سے کوئی خوش نہیں رہتا' اس لئے میرا جی نہیں چاہتا کسی سے پیار کرنے کو۔"

"دیکھو بیٹے کسی سے حکم منوانے اور کام لینے میں جتنا مزا ہے اس سے کہیں زیادہ مزا کسی اور کی بات ماننے اور خود اس کے کام آنے میں ہے۔"

"وہ کیسے ابو؟" فرحان نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ ایسے میرے بیٹے کہ فرض کرو تم نے کسی امتحان یا کھیل میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور بہت سے لوگ تمہیں مبارک باد دیں' تعریف کریں تو تمہیں کیسا محسوس ہوگا؟"

"ظاہر ہے بہت اچھا۔"

"لیکن اگر تم دوسروں کی کامیابی پر مبارکباد دینے کے عادی نہیں ہو تو انہیں کیا پڑی ہے کہ تمہاری خوشی کا خیال رکھیں اگر تم دوسروں سے محبت کرو گے تو وہ بھی جواب میں تمہیں پیار دیں گے اگر تم ان سے نفرت کرو گے تو بدلے میں وہ بھی تم سے نفرت اور حقارت کا سلوک کریں گے۔"

ابو نے غور سے دیکھا فرحان کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ بے حد متاثر ہے۔ ابو نے اپنی بات جاری رکھی۔

"پھر کسی کو چاہنے' خوش رکھنے اور اپنی چیز دے دینے میں جو بڑائی کا احساس ہے نا وہ انسان کو سچی

مسرت بخشتا ہے۔ یہ جذبہ نہ ہوتا تو والدین اپنی اولاد کی بھلائی کی خاطر اپنا آرام نہ مٹاتے' نہ ننھے منے پرندے اپنے بچوں کی خاطر صبح سے شام تک دانہ دنکا ڈھونڈتے پھرتے۔ کوئی کسی کے کام نہ آتا تب اس دنیا کا کیا حال ہوتا شاید تم اندازہ کرسکتے ہو۔"

ابو کا اندازہ درست تھا۔ فرحان کی سمجھ میں بہت کچھ آرہا تھا۔ اس کی بیماری میں امی کا رات بھر جاگنا۔ ان سب کی خاطر ابو کا انتھک محنت کرنا۔ انہیں تعلیم دینے کے لئے اساتذہ کی جدوجہد۔ بڑی جماعت کے لڑکوں کا اپنے سے چھوٹے لڑکوں کی مدد کرنا۔ سوچتے ہوئے اس کی نظر ذیشان پر پڑی جو بڑی محنت سے اس کی سائیکل صاف کررہا تھا۔

"شانی" اس نے بھائی کو آواز دی۔

"تمہیں سائیکل چلانا اچھا لگتا ہے؟"

"جی ..... جی بھائی جان' لیکن سچ بھائی جان میں نے آپ کی سائیکل کبھی نہیں چلائی۔" ذیشان گھبرا گیا۔

"کیوں وہ تمہارے لئے بھی تو ہے۔" فرحان نے محبت سے کہا۔ "اچھا ذرا اسے چلا کر تو دکھاؤ مجھے۔"

پہلے تو ذیشان کو یقین نہ آیا اور جب اسے پتہ چلا کہ فرحان سچ مچ اسے اجازت دے رہا ہے تو وہ "ہرا بھائی جان" کہہ کر بے اختیار اس سے لپٹ گیا اور زور سے اس کا منہ چوم کر سائیکل کی طرف دوڑا۔ فرحان کی نظر سامنے لگے آئینے پر پڑی' اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ "شاباش بیٹے' دیکھا محبت کا جادو۔" ابو نے مسکراتے ہوئے کہا

"یہ لو اپنا چپس کا پیکٹ" فرحان نے بے تابی سے پیکٹ کھولا چپس منہ میں رکھتے ہوئے اس کی نگاہ منی پر پڑی جو دور کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ رک گیا۔ منی ..... اے منی"

"جی بھائی جان" وہ دوڑتی ہوئی آئی۔

"ادھر آؤ میرے پاس یہ پیکٹ تم لے لو۔"

"کیوں بھائی جان؟" منی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کھانے کے لئے اور کس لئے؟" فرحان نے اسے پیار سے چپت لگائی۔

"ارے بیٹے یہ شریر تو اپنا حصہ سب سے پہلے کھا چکی ہے۔" امی نے کہا

"تو کیا ہوا امی' اس چٹوری بلی کو چپس پسند بھی تو بہت ہیں۔" فرحان نے جواب دیا تو منی نے بڑے لاڈ سے سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ امی ابو انہیں پیار سے دیکھ کر مسکرانے لگے۔ فرحان کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا سینہ چوڑا ہوگیا ہو جیسے اس کا خون بڑھ گیا ہو اور جیسے اس کے بہت سے ہاتھ' بہت سے پاؤں ہوگئے ہوں۔ ●●

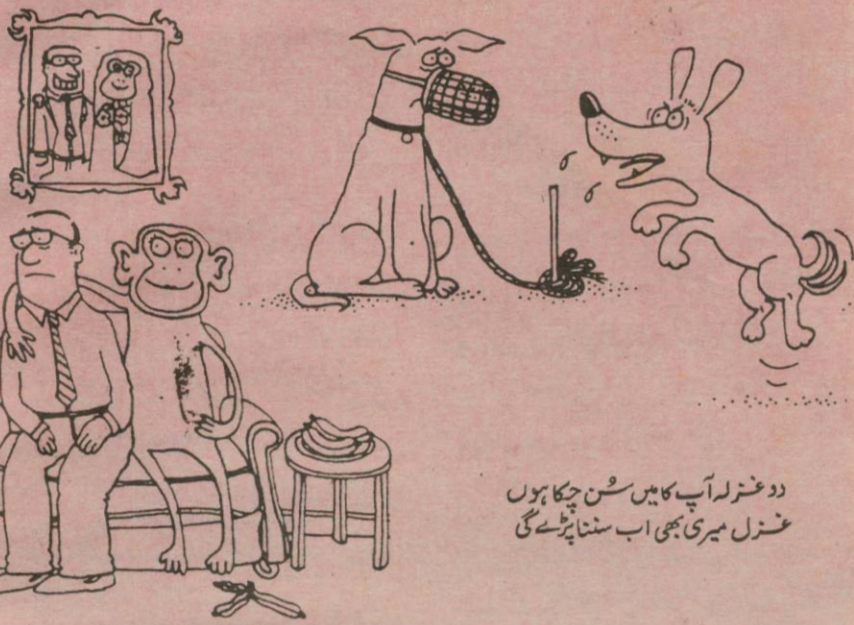

دو غزلہ آپ کا میں سُن چکا ہوں
غزل میری بھی اب سننا پڑے گی

خدا جوڑی سلامت رکھے۔

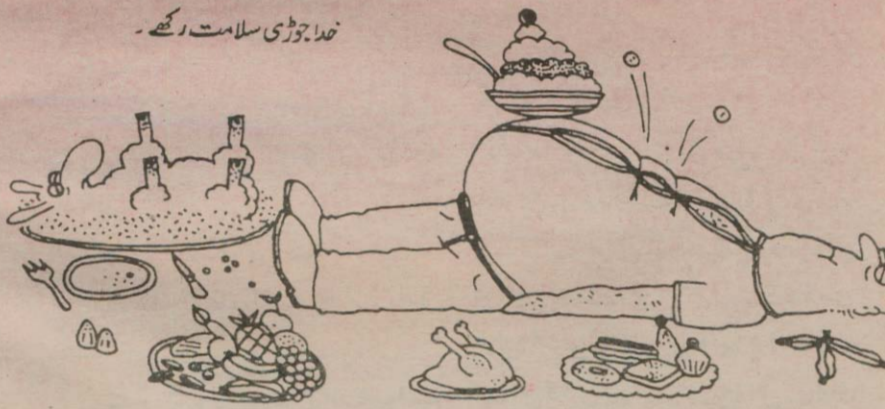

آئے کچھ گوشت کچھ کباب آئے
پھر جو آنا ہے وہ عذاب آئے

بنام آنکھ مچولی

قارئین کے منتخب خطوط

وسیم اطہر، بورے والا۔ اگست کا کرنیں بکھیرتا ہوا شمارہ ملا۔ تمام کہانیاں، خاص طور پر "اڑنے بھی نہ پائے تھے" بہت پسند آئیں۔ مجھے ایک بات افسوس کے ساتھ کہنی پڑ رہی ہے کہ ہما عثمان کا مضمون "ملا نصرالدین خوجہ" نقل شدہ ہے۔ ثبوت کے لئے تراشہ ارسال ہے۔۔۔ ☆ ہم آپ کے افسوس میں برابر کے شریک ہیں۔ نقل کرنے والے غیر اخلاقی حرکت تو کرتے ہی ہیں، اپنے ذہن و دل پر علم و فکر کے دروازے بھی بند کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم سے کہتے ہیں "آپ نے ہم پر اعتماد کیا، کتنا برا کیا۔" **میمونہ صدف، رحیم یار خان۔** تازہ شمارہ ہنستا مسکراتا، چمکتا دمکتا، جگمگاتا لہراتا ہوا ہمارے ہاتھ لگا۔ جلدی سے ہڑپ کر ڈالا، بہت مزے کا تھا "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش طبعی" اور کہانیوں میں "اڑنے بھی نہ پائے تھے" اور "بارش کے بعد" اچھی لگیں۔ گنگناتی نظمیں اور گدگداتے لطیفے بھی اچھے لگے آنکھ مچولی واقعی منفرد رسالہ ہے۔ لیکن اس کی قیمت۔۔۔۔ ☆ آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اگر شاعر نہیں تو آپ میں شاعرانہ جراثیم ضرور موجود ہیں۔ مگر قیمت کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے بدذوقی کا ثبوت دیا ہے۔ قافیوں کی روانی میں آپ قیمت کو بھی

لے آتیں تو کیا ہی اچھا ہوتا یعنی آپ لکھتیں جگمگاتا شمارہ، چمکتی نظمیں، گدگداتے لطیفے اور تاؤ دلاتی قسمت سب اچھا لگا۔ البتہ کھانا ہو یا کتاب جلدی سے ہڑپ کرنے سے سوائے بدہضمی کے کچھ اور حاصل نہیں ہوتا۔ **فرحین، کراچی۔** اگست کا شمارہ حیرت انگیز طور پر وقت سے بہت پہلے مل گیا۔ ابن آس کی کہانی "اور....." بہت پسند آئی۔ وجہ شاید یہ بھی ہو کہ میرا واسطہ بھی ایسے ہی دوستوں سے پڑا ہے اور ہو سکتا ہے ایسے تمام دوست جن کی نظروں سے یہ تحریر گزری ہو اپنے اچھے دوستوں کو کچھ دیر کے لئے یاد کرلیں۔۔۔ ☆ آنکھ مچولی میں حیرت انگیز طور پر کئی تبدیلیاں آرہی ہیں جو ہمارے اکثر قارئین کو بہت حیرت زدہ کریں گی۔ آپ حیرتی ہیں تو اس پر ہمیں کچھ حیرت نہیں ہے۔ "اچھے" دوستوں کو یاد کرنے کے لئے تحریر کی ضرورت کہاں ہوتی ہے بلکہ ان کی وجہ سے تو تحریریں وجود میں آتی ہیں۔ جیسے ابن آس کی "اور....." اچھی تحریروں کے لئے آنکھ مچولی کی چشم روشن اور دل ہمیشہ شاد رہے گا۔ **شیخ عبدالحمید عابد، کاموںکے۔ افضل حمید، فیصل آباد۔ نیا گل، حیدر آباد۔** آپ تینوں احباب نے "مظلوم بچے نمبر" کے حوالے سے خطوط لکھے ہیں۔ یہ خطوط ہمیں دیر سے ملے۔ تاہم اس کی پذیرائی کا شکریہ۔ ایک مشترکہ بات جو تینوں خطوں میں موجود ہے کہ یہ نمبر حکومتی ارکان کو بھی ارسال کرنا چاہئے کہ انہیں بھی پتہ چلے۔ تو عزیزو سچی بات یہ ہے کہ معلومات کے ذرائع ہم سے زیادہ حکومت کے پاس ہیں اسی لئے حکومت عوام سے زیادہ باخبر بھی ہوتی ہے۔ ہم نے اپنا کام کردیا۔ حکومت کے ارکان اپنے کام کے لئے خود جوابدہ ہوں گے اس دنیا میں نہیں تو اگلی دنیا میں ضرور ایسا ہوگا۔ **شبر علی چنگیزی، لاہور۔** کافی عرصے بعد آپ کو خط لکھ رہا ہوں مگر یہ نہ سمجھئے گا کہ قلمی تعاون نہ تھا۔ میں آنکھ مچولی باقاعدگی سے پڑھتا رہا ہوں۔ میں محسوس کررہا ہوں کہ آنکھ مچولی میں تبدیلیاں ہورہی ہیں۔ کچھ مجھے کسی سے معلوم بھی پڑا ہے ☆ چنگیزی صاحب آپ نے تسلیم کیا ہے کہ آپ کافی عرصے کے بعد خط لکھ رہے ہیں تو پھر وہ کیسا قلمی تعاون تھا جس میں آپ نے قلم تک نہیں اٹھایا۔ اور یہ جو آپ تبدیلیاں محسوس کررہے ہیں تو ہم آپ کی حسوں کی داد دیتے ہیں۔ ع زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔ اس شمارے میں تبدیلیاں بہت واضح اور نمایاں ہو کر آپ کے سامنے آگئی ہوں گی۔ البتہ آپ نے یہ وضاحت نہیں کی کہ وہ "کسی" کون ہے جس سے آپ کو "معلوم پڑا" ہے۔ آپ اُسے "گرا پڑا" ہرگز نہ سمجھئے گا۔ کیونکہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں اُس "کسی" نے آپ کو کتنی صحیح اطلاع دی تھی۔ **احمد خان درانی، کلور کوٹ۔** میں نے آپ کا رسالہ بڑے شوق سے پڑھا تو معلوم ہوا کہ واقعی یہ پڑھنے والی چیز ہے۔ مجھے یہ رسالہ بہت دیر سے ملا اس لئے میں اس رسالے کا ممبر شپ بننا چاہتا ہوں۔ ☆ ہم آپ کی پہلی بات سے سو فی صد اتفاق کرتے ہیں کہ آنکھ مچولی واقعی پڑھنے والی چیز ہے۔ لیکن دوسری بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ چونکہ آپ کو رسالہ بہت دیر سے ملا اس لئے آپ "ممبر شپ" بننا چاہتے ہیں۔ آپ غالباً

"ممبر" بننا چاہتے ہیں۔ مگر "ممبر شپ" کا "دیر" سے تعلق آپ نے خوب نکالا یعنی رسالہ آپ کو جلدی ملتا تو پھر اس کی ضرورت نہ تھی۔ یہ دیر کا پہلا فائدہ ہے جو ہمارے سامنے آیا۔ لیکن جناب دیر سویر سے آپ "ممبر شپ" کے متعلق پریشان نہ ہوں۔ آپ نے آنکھ مچولی پڑھنا شروع کیا، آپ آنکھ مچولی کی برادری میں شامل ہوگئے۔ آپ کی نظم، کہانی، مضمون، ہر چیز اس میں شائع ہوسکتی ہے۔ شرط صرف اور صرف معیار ہے۔ **شاہد اقبال، اکاڑہ۔** میں گزشتہ دو سال سے آنکھ مچولی پڑھ رہا ہوں۔ یہ میرا پہلا خط ہے سرورق لاجواب تھا۔ کہانیوں میں بارش کے بعد، اڑنے بھی نہ پائے تھے، ہم نے کلینک کھولا، ایک لڑکی کی فریاد، اور...... کسریٰ کے کنگن اور نظموں میں منافق، ایک چھوٹا سا بچہ اور نیا سال اچھی لگیں۔ ☆ تحریروں کی پسندیدگی کا شکریہ مگر دو سال میں صرف ایک خط؟ کیا واقعی ڈاک خانے والوں سے جھگڑا ہوگیا ہے؟ **ذیشان احمد شان، کوٹ رادھا کشن۔** آدابِ شاداب کے بعد عرض ہے کہ عرصہ ہائے سے آنکھ مچولی کا قاری ہوں۔ (میں نے) عرصہ پہلے ایک نہایت دل چسپ انگریزی ناول کا ترجمہ کیا تھا۔ کیا یہ آنکھ مچولی میں شائع ہوسکتا ہے؟ ☆ آپ عرصہ ہائے "دراز" لکھتے تو ہم اس سے وہی مراد لیتے جو لینا چاہئے۔ لیکن صرف ہائے ہمیں تشویش میں مبتلا کر رہی ہے کہ خدانخواستہ یہ "ہائے ہائے" کا ایک حصہ تو نہیں۔ اور جہاں تک کسی تحریر کی اشاعت کا تعلق ہے تو اسے پڑھے بغیر کیسے کچھ کہا جاسکتا ہے؟ خدا کرے کہ آپ کے لئے یہ جواب غیر شاداب نہ ہو۔ **کمال احمد حازم، حیدر آباد۔** ☆ آپ کی تحریریں مل گئی ہیں۔ فیصلہ باقی ہے۔ آپ آنکھ مچولی کے لئے بصد شوق لکھتے رہئے اچھی تحریروں کے لئے اس کے دروازے ہمیشہ کھلے ہیں۔ ہماری ہمت کی داد دیجئے۔ ورنہ یہ دَور "دروازے کھلے رکھنے" کا نہیں ہے۔ **بینش معین، ملتان۔** میں نے پہلے بھی آپ کو دو تحریریں اور ایک نظم بھیجی ہیں لیکن ان کے بارے میں پتہ نہیں چل سکا۔ اگر آپ یہ رہنمائی فرمادیا کیجئے کہ تحریر میں کیا کمزوری ہے تو اس کے لئے محنت ہوسکتی ہے۔ ☆ بینش بی بی! آپ کی معرفت کچھ باتیں تمام قارئین سے : ایک تو یہ کہ لکھنے والوں کو احتیاطاً اپنی تحریروں کی کاپی اپنے پاس رکھنی چاہئے کیونکہ ناقابل اشاعت تحریریں بھی کچھ عرصہ کے بعد ضائع کردی جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ جواب طلب امور یا تحریر کی واپسی کے لئے لازمی طور پر جوابی لفافہ جس پر آپ کا پتہ ہو، ارسال کرنا چاہئے اور تیسری بات یہ کہ کاموں کی فراوانی اور وقت کی تنگی میں، آپ خود اندازہ کریں، کہ ہم ہر تحریر کے بارے میں یہ نہیں بتاسکتے کہ کیا کمزوری ہے۔ البتہ بینش آپ کا یہ جذبہ قابل قدر ہے کہ محنت ہوسکتی ہے۔ کوئی بھی قلمکار اگر محنت سے گھبراتا نہیں ہے تو وہ ایک دن بڑا لکھاری ضرور بن سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیتے۔ اس کے لئے بہترین طریقہ مطالعہ ہے۔ اچھی کتابوں اور کامیاب قلم کاروں کا مطالعہ کیجئے۔ مسلسل مطالعہ آپ کو آپ کے سوالوں کے جواب خود فراہم

کردے گا۔ **عثمان عدیل، جہلم۔** ایک اچھی اور اخلاقی سبق والی کہانی ارسال کررہا ہوں۔ امید ہے کہ میری محنت ردی کی ٹوکری میں جانے سے بچ جائے گی۔ **شمائلہ خان، کراچی۔** میں نے ایک نظم "روشن مستقبل" بھیجی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ نظم اتنی بری نہیں تھی کہ آپ اس کو ردی کی ٹوکری کی نذر کردیں۔ **ملیحہ ثانیہ سحرش، واہ کینٹ۔** میں نے اب سے تقریباً ایک برس پہلے ایسی اوٹ پٹانگ تحریریں بھیجیں کہ آپ کو میرا نام اب بھی یاد ہوگا۔ میں مانتی ہوں کہ وہ تحریریں اس قابل نہیں تھیں کہ آنکھ مچولی میں جگہ پاتیں۔ اس بات سے دل برداشتہ ہو کے میں نے آنکھ مچولی پڑھنا تو کیا..... کہانیاں لکھنا ہی ترک کردیا۔ **شاہد الرحمٰن چوہدری** تازہ شمارہ پڑھ کر احساس ہوا کہ آپ نے میری "بلا عنوان" کہانی کو نظرانداز کردیا۔ میں نے یہ تحریر بہت محنت سے لکھی تھی۔ ☆ عثمان، شمائلہ، ملیحہ، شاہد اور اسی طرح کے بہت سے خطوط نگار۔ ہم یہ تو مانتے ہیں کہ ہر لکھنے والا اپنے طور پر تحریر کو محنت سے لکھتا ہے اور اس کے نزدیک اس کی تحریر بہترین ہوتی ہے۔ کچھ دوست یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ان کی تحریر اتنی اچھی نہیں تھی..... یا اتنی بری نہیں تھی) تو دل برداشتہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اور محنت کیجئے۔ آپ نے ایک بات پر غور نہیں کیا کہ ناقابل اشاعت تحریروں کا عنوان ہے "مزید محنت کی ضرورت ہے۔" ہم یہ نہیں کہتے کہ "محنت نہیں کی۔" ہم تو کہتے ہیں مزید محنت کیجئے۔ **حلیمہ سعدیہ، سرائے عالمگیر۔** ☆ آپ کی تجویز مناسب ہے اس پر ضرور غور کیا جائے گا۔ **شاہینہ اور بھائی۔** ہم لوگ تو سخت مایوس ہوگئے تھے۔ سو اب پھر چھ، سات ماہ بعد ہمت کر کے خط لکھ ہی ڈالا۔ پلیز جلدی سے کوئی تحریری مقابلہ کروائیں۔ ☆ اچھے بچوں کو (بڑوں کو بھی) مایوس بالکل نہیں ہونا چاہئے۔ اور ہمیں تو یہ بھی پتہ نہیں کہ آپ کی مایوسی کی وجہ کیا تھی بخیر آپ نے ہمت کی اچھا کیا۔ آپ مزید ہمت کریں۔ مقابلے، کوئز، انعامات سب آپ کی ہمت کو اکسارہے ہیں اور مقابلوں کے لئے تو باقاعدہ ایک نمبر یعنی "مقابلہ نمبر" بھی مخصوص کردیا گیا ہے۔ **عطاء اللہ بھٹو، گھونکی۔** ☆ یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ اپنے ابو کی خواہش کی تکمیل کے لئے دن رات محنت کررہے ہیں۔ ہم آپ کے لئے دعاگو ہیں۔ آپ جیسے محنتی نوجوان ہی تو پاکستان کا "مان و سنگھار" ہیں۔ **حسنین عباس، جھنگ۔** ☆ ناراض بھائی یہ بات تو ٹھیک ہے کہ سفارش کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں ہوتی مگر وہ سفارش ایسی ہے کہ آپ بھی لاسکتے ہیں بلکہ ہر شخص لاسکتا ہے یعنی خوب محنت اور اچھا معیار۔ آپ خود سوچیں، مایوس اور ناامید شخص خوب محنت کیسے کرسکتا ہے۔ ننھے ذہنوں میں کوئی برا خیال نہیں آنا چاہئے۔ آنکھ مچولی پورے پاکستان کا اور پاکستان کے سارے بچوں اور نوجوانوں کا رسالہ ہے بلکہ بڑوں کا بھی۔

☆ **محمد رحمت اللہ بشیر، گجرات۔** تازہ شمارہ دیکھ کے آپ کا اندیشہ تو دم توڑ گیا ہوگا اور آپ کو یقین آگیا ہوگا کہ رسالہ خدانخواستہ بند نہیں ہورہا۔ آپ کے محبت بھرے خط اکثر ملتے رہتے ہیں جن کے آخر میں لکھا

ہوتا ہے۔ "مجھے معاف کردیں خوامخواہ خط میں الٹی سیدھی باتیں لکھ دیں۔" ہم آپ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آخر آپ کو کس حکیم نے مشورہ دیا ہے کہ آپ الٹی سیدھی باتیں لکھا کریں اور پھر معافی کے طلب گار ہوں۔ آپ یہ ضرور واضح کریں کہ آپ الٹی سیدھی باتوں کی وجہ سے معافی مانگتے ہیں یا معافی کی وجہ سے الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں۔

------اور عزیزو خطوں کے ڈھیر میں سے کچھ نام ایسے -----۔ مگر ٹھہریں پہلے نام پڑھ لیں۔

رفیق ریاض، انیسہ دوست محمد، امین آباد۔ صبرینہ ڈوگر اسلام آباد۔ نائیلہ، رومانہ، بہروز، مالاکنڈ ایجنسی۔ عابد الرحمٰن چوہدری سرگودھا۔ صوفیہ سلطان، کراچی۔ نعمان عزیز، کراچی۔ حیدر مرزا، کراچی۔ ثاقب حبیب پنڈی، سیدپور۔ حلیمہ ناز عبدالستار، کراچی۔ حسن طاہر، بورے والا۔ النصر رضا، منڈی بہاؤالدین۔ آپ سب نے تقریباً" ایک جیسی باتیں لکھی ہیں یعنی پہلی دفعہ شرکت کی ہے۔ نام ضرور شائع کریں۔ حوصلہ افزائی ہوگی ورنہ بے عزتی ہوگی وغیرہ وغیرہ" بھئی ایک بات آپ سب کو (ستمبر میں قائداعظمؒ کے حوالے سے خاص طور پر) ہر وقت یاد رکھنا چاہئے کہ نام محنت سے بنتا ہے۔ اور بے عزتی سے صرف اس وقت ڈرنا چاہئے جب خدانخواستہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو رہی ہو۔ باقی آنکھ مچولی آپ کا اپنا رسالہ ہے۔ پڑھ پڑھ کے لکھئے اور لکھ لکھ کے پڑھئے۔ غرض لکھنا پڑھنا اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں۔ یقیناً" ایک روز آپ کے دروازے پر دستک ہوگی۔ آپ پوچھیں گے "کون؟" جواب آئے گا۔ "کامیابی۔"

●●●

دُعا
ربّ سے
ہمارے تعلق کا
دوسرا نام
ہے

ادارہ آنکھ مچولی نے منتخب دعاؤں کے ۱۲ خوبصورت اسٹیکرز تیار کئے ہیں
ایسی دُعائیں
جو نظر کے سامنے ہوں تو اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہونے دیتیں
۱۲ اسٹیکرز کا ہدیہ ۳۶ روپے صرف
آنکھ مچولی کے پتے پر خط لکھئے یا فون کیجئے
۱۔پی آئی بی کالونی۔ کراچی فون ۴۹۴۲۸۵۷ ۴۹۴۸۲۱۰

آنکھیں

شیخ عبدالحمید عابد

قدرت نے زندہ اجسام کی دُنیا کو دو بڑے حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصّہ نباتات کا ہے۔ دوسرا حیوانات کا۔ نباتات اگرچہ اپنی زندگی کے لئے روشنی اور حرارت کے محتاج ہیں مگر وہ روشنی دیکھنے سے قاصر ہیں۔ اس کے برعکس قدرت نے حیوانات کو بصارت عطا کرنے میں ہزارہا طریقوں سے کام لیا ہے اور اَن گنت طرز کی آنکھیں عطا کی ہیں۔

پرندوں اور دودھ پلانے والے جانوروں کی آنکھیں نہایت اعلیٰ اور مکمل ہیں اِن کی کارکردگی موجودہ زمانے کے بہترین کیمرے سے مشابہ ہے۔ اس قسم کی آنکھ کے اندر ایک شفاف عدسہ ہوتا ہے۔ جو کیمرے کے اصول پر منظر کا عکس آنکھ کے اندرونی پردے پر منتقل کردیتا ہے۔ یہ پردہ آج کل کی تیز سے تیز فلم سے زیادہ حسّاس ہے اور روشنی کی نہایت قلیل مقدار کو بھی محسوس

کرلیتا ہے۔

چھوٹے جانوروں کی آنکھیں بھی عام طور پر چھوٹی ہوتی ہیں۔ مثلاً چوھیا کی قسم کے ایک جانور کی آنکھ سرسوں کے دانے کے برابر ہوتی ہے۔ لیکن یہ جانور اپنی اسی آنکھ کے ذریعے تمام چیزیں آسانی سے دیکھ لیتا ہے۔

دنیا میں حشرات الارض کی ہزارہا قسمیں پائی جاتی ہیں۔ ان کی آنکھیں بھی عجیب عجیب ہیں اور مختلف انداز میں کام کرتی ہیں۔ مثلاً مکڑی کی آنکھ سادہ نوعیت کی ہے۔ اس آنکھ کا عدسہ شعاعوں کو جمع کر کے ان حساس رگوں پر مرکوز کردیتا ہے جو عدسے کے نیچے واقع ہیں۔ اس قسم کی آنکھ اردگرد کے منظر کا دھندلا سا خاکہ پیش کرتی ہے جس سے صرف اندھیرے اُجالے کا فرق ہی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ سادہ آنکھ مختلف چیزوں کی شکل اور بناوٹ کو واضح طور پر نہیں دکھا سکتی۔ قدرت نے اس کمی کو یوں پورا کیا ہے کہ مکڑی کے سر میں اس طرح کی آٹھ آنکھیں لگادی ہیں جن کی مجموعی کارکردگی سے مکڑی کو اپنے گردو پیش کا تفصیلی جائزہ لینے میں کوئی دُشواری پیش نہیں آتی۔

بِڈے کے سر میں پانچ الگ الگ آنکھیں ہوتی ہیں ان میں سے تین تو سادہ قسم کی نہایت چھوٹی اور دو بڑی بڑی مرکّب آنکھیں سر کے دائیں بائیں دونوں طرف نمایاں طور پر نصب ہیں۔ مرکب آنکھ بناوٹ کے لحاظ سے بڑی پیچیدہ ہے اور اسے قدرت کا حیرت انگیز کارنامہ سمجھنا چاہئے۔ اس قسم کی آنکھ سادہ طرز کی سینکڑوں بلکہ ہزاروں ننھی ننھی آنکھوں سے مل کر بنتی ہے جنہیں خرد بین کے بغیر دیکھا نہیں جاسکتا۔ بے شمار اجزا میں سے ہر ایک کے اندر الگ عدسہ اور اس کے نیچے روشنی کو محسوس کرنے والے اعصاب موجود ہوتے ہیں۔ عام مکھی کی آنکھ بھی ایسی ہوتی ہے۔ مکھی کے سر کا جو حصّہ ہمیں بھورے رنگ کا نظر آتا ہے۔ وہ دراصل اس کی مرکّب آنکھ ہوتا ہے اگر مکھی کا سر خرد بین کے نیچے رکھ کر دیکھا جائے تو اس پر شہد کا چھتا سا بنا ہوا نظر آئے گا اور اس میں جتنے دانے نظر آئیں گے وہ سب اس مرکّب آنکھ کے اجزا ہوں گے۔

ڈریگن فلائی بڑے بڑے پروں والے اس کیڑے کو کہتے ہیں جو جھاڑیوں اور پودوں پر منڈلاتا نظر آتا ہے۔ حیاتیات کے ماہرین نے اس کیڑے کی مرکّب آنکھ کو دوسرے کیڑے مکوڑوں کی آنکھ کے مقابلے میں اس لئے پیچیدہ قرار دیا ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں بیس بیس ہزار چھوٹی چھوٹی آنکھوں پر مشتمل ہیں۔

انسانی آنکھ کیڑے مکوڑوں کی مرکّب آنکھ

سے مختلف نوعیت رکھتی ہے۔ چنانچہ ہمارے لئے یہ تصوّر کرنا بھی مشکل ہے کہ مرکّب آنکھ والے جانور کو کیسا منظر دکھائی دیتا ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ان جانوروں کو یہ دنیا بے شمار روشن اور تاریک دھبوں کا ایک بے ڈھنگا سا خاکہ دکھائی دیتی ہوگی۔

پرندوں کی بینائی بہت تیز ہوتی ہے۔ چیلوں، گدھوں اور عقابوں کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ بہت بُلندی سے زمین پر اپنی خوراک دیکھ لیتے ہیں اور آناً "فاناً" نیچے اُتر آتے ہیں۔

بعض جانور اپنی طاقتور بصارت کے ذریعے بہت دور کی چیزیں واضح طور پر دیکھ لیتے ہیں۔ بعض جانور ایسے ہیں جو صرف قریب کی چیزیں دیکھ سکتے ہیں۔ انسان کے علاوہ اور بہت کم ایسے جانور ہیں جن کی آنکھیں دور اور نزدیک کی اشیا کو یکساں وضاحت کے ساتھ دیکھ سکتی ہیں۔ مکڑی آٹھ آنکھوں کے باوجود صرف پانچ انچ کے فاصلے تک دیکھ سکتی ہے۔ اس کے باوجود بہت سے ایسے پرندے بھی ہیں جن کی آنکھیں انہیں بیک وقت خوردبین اور دوربین کا کام دیتی ہیں۔

جسمانی اعتبار سے پرندوں کی آنکھیں دوسرے جانوروں سے بڑی ہوتی ہیں۔ ان کی آنکھ کا جو حصّہ باہر سے نظر آتا ہے۔ اس سے اس کی جسامت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ حقیقت میں ان کی آنکھ کے ڈھیلے کا بڑا حصّہ کھوپڑی کے اندر چھُپا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر اُلّو کو دیکھیئے۔ بڑے سے بڑے اُلّو کا وزن انسان کے وزن کے تیسویں حصّے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ مگر اس کی آنکھوں کے ڈھیلے انسانی آنکھوں سے کہیں زیادہ بڑے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُلّو کی کھوپڑی کے اندر بھیجے کے لئے بہت کم گنجائش باقی رہتی ہے۔ اس کے سر کی آدھی سے زیادہ جگہ پر تو آنکھوں نے قبضہ جما رکھا ہے۔

خشکی پر رہنے والے جانوروں میں سب سے بڑی آنکھ کس کی ہے؟ آپ کہیں گے، ہاتھی کی گینڈے کی۔ جی نہیں سب سے بڑی آنکھ شُتر مُرغ کی ہے۔ اس کی آنکھ کا ڈھیلا مالٹے سے کچھ بڑا ہوتا ہے۔ شیر کی آنکھیں اس کے قد و قامت کے لحاظ سے اگرچہ چھوٹی ہوتی ہیں۔ مگر نظر بلا کی تیز ہے۔

اکثر جانوروں کی آنکھیں ساکن اشیا کو کم اور حرکت کرتی ہوئی اشیا کو اچھی طرح دیکھ سکتی ہیں۔ سانپ کے بارے میں مشہور ہے کہ اسے وہ اشیا دکھائی نہیں دیتیں جو بالکل ساکن ہوں۔ مینڈک کھانے والا سانپ جب اپنے شکار کا تعاقب کرتا ہے، تو وہ دوڑتے ہوئے مینڈک کو آسانی سے دیکھ لیتا ہے۔ لیکن قدرت نے مینڈک کو بھی جان بچانے کا طریقہ سکھادیا ہے۔

ایسے موقعے پر وہ چند لمبی چھلانگیں لگا کر پتھر کی طرح بے حس و حرکت ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سانپ کو وہ نظر نہیں آتا۔ کتوں اور بلّیوں کی آنکھوں میں بھی یہی خصوصیت موجود ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بلّی کی نظر بھاگتے ہوئے چوہے پر ہم سے پہلے پڑتی ہے۔ وہ چوہے پر ہمیشہ اس وقت جھپٹتی ہے جب وہ حرکت کرتا ہے۔

جن جانوروں کی آنکھیں زیادہ بڑی ہیں ان کی زندگی کی مصروفیات اکثر رات کے وقت شروع ہوتی ہیں۔ ان جانوروں میں اُلّو، اُڑنے والی گلہری کے نام زیادہ نمایاں ہیں بڑی آنکھوں کا مقصد زیادہ سے زیادہ روشنی حاصل کرنا ہے اِس لئے وہ دن کی تیز چمک برداشت نہیں کر سکتیں ایسے جانور دن کے اُجالے میں باہر نہیں نکلتے۔

جانوروں میں رنگوں کو دیکھنے اور ان میں تمیز کرنے کی اہلیت مختلف ہے۔ سفید روشنی جن سات رنگوں سے مل کر بنی ہے۔ وہ قوس قزح میں ایک دوسرے سے الگ نظر آتے ہیں ان کے علاوہ ایک آٹھواں "رنگ" ہے جسے انسانی آنکھ بھی دیکھنے سے قاصر ہے۔ یہ بالائے بنفشی رنگ ہے۔ بعض جانور یہ رنگ دیکھ سکتے ہیں۔ مگر بحیثیت مجموعی جانوروں کی آنکھیں رنگوں میں تمیز نہیں کر سکتیں ماہرین بتاتے ہیں کہ انسان، بندر، لنگور، اور پرندے، "دنیا کو" رنگین دیکھتے ہیں۔

باقی جانوروں کو وہی مناظر سیاہ اور سفید نظر آتے ہیں۔

قدرت نے ہر جانور کو اس کی ضروریات اور جسمانی اہلیت کے مطابق آنکھیں دی ہیں۔ خرگوش کی آنکھیں اس کے سر میں دائیں اور بائیں پہلو کی جانب ہیں اِس سے خرگوش سر گھمائے بغیر چاروں طرف دیکھ لیتا ہے۔ اس کے برعکس چیتے کی دونوں آنکھیں سامنے کے رُخ ہیں۔ جب وہ کسی چیز پر نگاہ ڈالتا ہے تو دونوں آنکھیں اسی چیز پر مرکوز ہوتی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ چیتا کتنا پھُرتیلا اور طاقتور شکاری جانور ہے۔ اسے ان آنکھوں کی ضرورت نہیں جو خرگوش کی طرح ہر طرف کا منظر دکھائیں۔

انسان کی آنکھیں بھی سامنے کی طرف رہتی ہیں اور مل کر ایک ہی چیز دیکھتی ہیں اس سے منظر کی وُسعت اور گہرائی کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہماری آنکھیں بھی خرگوش کی طرح پہلوؤں کی طرف ہوتیں تو نہ جانے کیسی کیسی اُلجھنیں اور پریشانیاں ہوتیں اور چہرے کی بناوٹ کیسی بے ہنگم نظر آتی۔

مگرمچھ اور دریائی بھینسے کی آنکھیں پیشانی کی جگہ واقع ہیں۔ پانی کے اندر یہ آنکھیں پیری اسکوپ کا کام دیتی ہیں، تیرتے وقت ان جانوروں کا تمام جسم پانی میں اور آنکھیں باہر رہتی ہیں۔

آنکھ جیسے نازک اور مُفید عضو کی حفاظت اور صفائی کا انتظام بھی قدرت نے کر رکھا ہے۔ کیڑے مکوڑوں کی اگلی ٹانگوں کے ساتھ نہایت باریک بالوں کے بُرش لگائے گئے ہیں جن سے وہ دھول اور گرد و غُبار صاف کرلیتے ہیں۔ کیڑے کی آنکھوں پر پپوٹے نہیں ہوتے۔ آپ نے بار ہا دیکھا ہوگا کہ مکھی اپنے سر کو اگلے بازوؤں میں پکڑ کر اِدھر اُدھر گھماتی ہے جیسے پالش کررہی ہو۔ اصل میں وہ آنکھوں کی صفائی کرتی ہے۔

مچھلیوں کی آنکھیں پانی میں خود بخود دُھلتی رہتی ہیں ریڑھ کی ہڈی والے وہ تمام جانور جو خشکی پر رہتے ہیں، پپوٹے رکھتے ہیں۔ جن سے آنکھوں کی حفاظت اور صفائی ہوتی ہے۔ البتہ سانپ کے پپوٹے نہیں ہوتے۔ اس کی آنکھ پر نہایت باریک اور شفاف جھلّی ہوتی ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ جھلّی دُھندلاتی ہے اور جب سانپ اپنی کینچلی اتارتا ہے تو اس کے ساتھ ہی پُرانی جھلّی بھی دور ہوجاتی ہے۔ چھپکلی اکثر اپنی آنکھیں زبان سے صاف کرتی ہے۔

پرندوں اور بعض دوسرے جانوروں کی آنکھوں پر تین پپوٹے ہوتے ہیں۔ تیسرا پپوٹا شفاف جھلّی کا ہوتا ہے اور بیرونی دو پپوٹوں کے اندر رہتا ہے۔ پرندے عموماً اسی سے آنکھ جھپکاتے ہیں پرندے اُڑتے وقت یہ پپوٹا گرالیتے ہیں

جاندار جو ختم ہو رہے ہیں

جانوروں، پرندوں، پودوں اور درختوں کی ہزاروں قسمیں کرۂ ارض سے ناپید ہو چکی ہیں۔ ایک عالمی تحقیقی ادارے "ورلڈ واچ انسٹی ٹیوٹ" کی حالیہ رپورٹ کے مطابق ہر دس سال میں جانوروں (جن میں بحری اور بری کیڑے مکوڑے بھی شامل ہیں) کی ایک ہزار چھ سو سے ایک ہزار نو سو پچاس قسمیں ہمیشہ کے لئے ختم ہو رہی ہیں۔ پودوں اور درختوں کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ان کی ایک قسم ہر روز ختم ہوتی ہے۔ اگر ادھر توجہ نہ دی گئی تو ہر گھنٹے بعد جانوروں پرندوں اور نباتات کی ایک قسم ختم ہونے لگے گی اور زمین بعض خوب صورت جانوروں اور پرندوں اور پودوں سے محروم ہو جائے گی۔

مرسلہ: عبدالستار خان طاہر، بوریوالہ

جس سے آنکھ گرد و غبار سے محفوظ رہتی ہے۔ مگر دیکھنے میں کوئی رُکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔

ہر جانور کی آنکھ کے بارے میں یہ سائنسی حقیقت ذہن میں رکھنی چاہئے کہ دیکھنے کا عمل آنکھ میں نہیں بلکہ دماغ کے اندر مُکمل ہوتا ہے۔ جس چیز کی طرف نگاہ کی جائے اس کی ایک چھوٹی سی تصویر آنکھ کے اندرونی پردے پر بن جاتی ہے۔ اس عکس کی تفصیلات ایک عصبیے کے ذریعے دماغ کے اس حصّے میں پہنچتی ہیں جو بینائی کو کنٹرول کرتا ہے۔

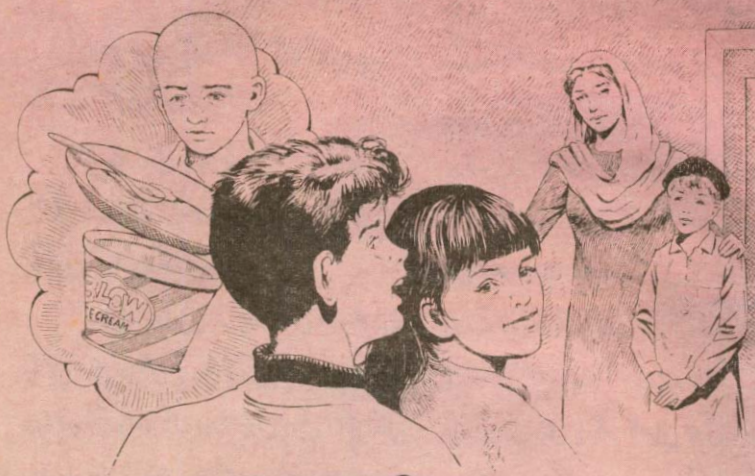

چٹورا چور

مرسلہ: محمد عمر قریشی

چور تو بہت سنے اور پڑھے تھے، مگر ایسا چور جو صرف ہماری ہی کھانے کی چیزیں چوری کرتا تھا، نہ جانے کون تھا۔ سخت پریشانی، حیرانی اور دکھ تھا کہ آخر کون ہے جو ہماری دل پسند خوراک پر گزارا کر رہا ہے۔ بھوت پریت کا بھلا اس گھر میں کیا کام؟

"آخر وہ کون ہے جو ہماری خوراک استعمال کرتا ہے؟" ہم نے رونی صورت بناتے ہوئے امی سے اپنے دکھ کا اظہار کیا۔ "ہوا کیا ہے کیوں شور مچا رہے ہو؟" امی نے ناراض ہو کر پوچھا۔

"امی! کل رات میں آئس کریم لایا تھا، اور اب وہ غائب ہے۔ آخر میری چیزوں کا دشمن کون ہے؟"

"ہمیں نہیں معلوم اپنی چیزوں کا خیال خود رکھا کریں۔" امی نے تنگ آ کر کہا۔

"ہمیں تو چور گھر کا کوئی فرد ہی لگتا ہے۔"

ہم نے بہن بھائیوں کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"بھائی جان دیکھئے الزام لگانا گناہ ہے۔" منے نے نصیحت آمیز جملہ کسا۔

"ہائے میری بے چاری آئس کریم، کتنی مشکل سے پیسے جمع کر کے لایا تھا، نہ جانے کس ظالم کی نظر اسے کھا گئی؟"

"اعلان کروادیں کہ چور بھائی اگر تم نے آئس کریم کھا بھی لی ہے تو کوئی بات نہیں۔ لیکن ذرا چہرہ تو کروا دو تاکہ ہمارا اپنوں پر کچھ اعتماد بحال ہو جائے۔" باجی نے نصیحت آموز انداز میں مشورہ دیا۔ ہم نے کھا جانے والی نظروں سے باجی کو دیکھا لیکن غصہ پی گئے۔

"ناشتہ کرو اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔" امی جان نے حکم دیا۔

"ہمیں نہیں کرنا ناشتہ، آج تو ہم بھوک ہڑتال کریں گے اور یہ بھوک ہڑتال بھی اس وقت تک رہے گی جب تک ہمیں نئی آئس کریم کے پیسے نہیں مل جاتے۔" ہم نے فیصلہ کن انداز میں احتجاج کیا۔ اور امی نے فوراً ہی آئس کریم کے پیسے دے دیئے۔ اور ہم ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔

اسکول سے واپسی پر آئس کریم کھائی تو مزہ آگیا۔ لیکن پھر بھی اس آئس کریم کی طرف بار بار دل ناداں جا رہا تھا جو ہماری خوراک نہ بن سکی تھی۔ آخر کون ہے جو ہماری چیزیں بے دردی سے ہڑپ کر جاتا ہے؟ یقیناً" کوئی بیرونی ہاتھ ہی ہوگا۔ کیوں کہ عام طور پر بیرونی ہاتھ ہی لوٹ مار مچاتے ہیں۔ واپسی پر کئی سوالات ہمارے دماغ میں ابھر رہے تھے۔ جاسوسی کا شوق تو ہمیں ورثے میں ملا تھا۔ کیوں نہ اس چور کو پکڑ کر اپنا نام روشن کیا جائے، اگر وہ چور پکڑا گیا تو ہمارے خاندان کی پہلی یادگار کامیابی ہوگی۔ یہ سوچتے ہوئے ہم گھر پہنچے اور بڑے بھائی جان کی کتابوں کی الماری میں سے جاسوسی کے ناول نکال کر پڑھنا شروع کر دیئے۔ یہ ناول ہم اسکول کی کتابوں میں چھپا کر پڑھتے تھے تاکہ پکڑے نہ جائیں۔ گھر کے تمام افراد ہمارے ذوق و شوق پر حیران ہونے لگے کہ ہم جو کتاب کو آئس کریم کے بغیر چھوتے تک نہیں تھے مسلسل ذوق و شوق سے کیوں پڑھ رہے ہیں۔ آخر ایک ناول میں ہمیں کامیابی کی کرن نظر آئی۔ اور ہم نے منصوبہ بندی شروع کر دی۔ اسی رات ہم نے ضد کر کے کھیر بنوائی اور اسے میز پر خوب صورتی سے سجا دیا۔ کھیر تو ہماری جان تھی مگر چور کو پکڑنے کی کوشش میں ہم اسے وقتی طور پر نہ کھا سکے۔

بس حسرت بھری نگاہوں سے اسے تکتے رہے۔

کھیر کی خوشبو پورے باورچی خانے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہم ایک کونے میں جا کر چھپ گئے۔ اور چور کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ کافی دیر تک کچن میں کوئی بھی نہ آیا۔ ہم وہاں بیٹھے بیٹھے تھک گئے۔ اس وقت ٹی وی پر کوئی پروگرام آرہا تھا اور سب ٹی وی دیکھنے میں محو تھے۔ اچانک گھنٹی بجی لیکن کسی نے دروازے پر جانے کی زحمت نہ کی۔ چاروناچار ہمیں ہی جانا پڑا۔ لیکن باہر کوئی بھی نہ تھا ہم غصے میں بھرے واپس کچن میں آگئے۔ اچانک ہماری نظر کھیر کی پلیٹ پر پڑی جو خالی تھی اور ہمارا منہ چڑا رہی تھی۔

"ہائے ہماری کھیر۔" ہمارے منہ سے بے اختیار نکلا اور ہم برابر والی کرسی پر دراز ہوگئے۔

"ہمارے خلاف سازش ہوئی ہے۔ دھوکے سے دروازے پر بلانا، گھر سے کسی اور کا نہ جانا اور اسی وقت کھیر کا صفایا ہونا کسی بین الاقوامی سازش کا ہی نتیجہ ہے۔ کون ہے جو ہماری صحت اور غذا کا دشمن بنا ہوا ہے۔" ہم بڑبڑائے اور کھیر کی پلیٹ کو بڑی حسرت بھری نظروں سے تکنے لگے۔ مگر یہ کیا "بال!!!" ہماری نظر پلیٹ پر چپکے بال پر پڑی جو شاید چور بھاگتے ہوئے گھبراہٹ کے عالم میں چھوڑ گیا تھا۔ ہمارے منہ سے بے اختیار نکلا "بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔" ہم نے اس بال کو کھیر کی پلیٹ سے علیحدہ کیا۔اب ہمیں چور کا سراغ لگانے میں آسانی ہوجائے گی یعنی جس کی ٹنڈ کا ایک بال کم ہوگا، سو فیصد وہی چور ہوگا ہم نے حتمی فیصلہ کرلیا۔

بال ناپا تو وہ پورے دو بالشت کا نکلا۔ بال تھامے ہم کمرے میں گئے اور بال کا رنگ امی ابو سمیت سب کے سروں کے بالوں سے ملانے لگے۔لیکن باجی سے لے کر بھائی اور امی ابو سب کے بال کٹے ہوئے تھے۔ یعنی سب کے بال ہیرو کٹ تھے۔

ڈرامے کے بعد ہم نے امی سے کہا۔ "امی جان ہماری کھیر پھر کوئی چور کھا گیا اور نشانی کے طور پر وہ اپنا بال چھوڑ گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ بال ہے کس کا؟ مجھے سب کے بال گننے ہوں گے۔ جس کا بھی ایک بال کم ہوگا وہی چور ہوگا۔"

"بھئی تم تو کمال کے جاسوس نکلے، کیا کمال کا نقطہ نکالا ہے۔" امی جان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"امی جان بس آپ کی دعا ہونی چاہئے اب آپ دیکھئے گا کہ میں چور کو کیسے پکڑتا ہوں۔" ہم

ان کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے گھر سے باہر نکل آئے دروازے پر ہی ہم نے چور کو پکڑ لیا۔ اس نے اپنے بالوں کو شناخت سے بچانے کے لئے ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اور دروازے کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ ہم اسے بڑی مشکل سے بہلا پھسلا کر گھر لے آئے۔ تمام اہل خانہ کے سامنے وکیل کی طرح ہم نے بال اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"تم اس بال کو پہچانتے ہو؟" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ تو ہم نے دوسرا سوال کر ڈالا۔

"جس وقت کھیر چوری ہوئی، تم کیا کر رہے تھے؟"

"اس وقت میں ٹی وی پر ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔"

امی یہ بات نوٹ کرلیں کہ "یہ کھیر کی چوری ہونے کے وقت ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ یعنی اسے چوری کا وقت پتا ہے۔" ہم نے امی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے ٹوپی کیوں پہن رکھی ہے، تاکہ تمہاری اس بال کی وجہ سے شناخت نہ ہو جائے؟"

اس سوال پر وہ لڑکا سہم گیا۔ "امی مبارک ہو چور پکڑا گیا۔ میں کامیاب ہو گیا۔" میں خوشی سے چیخا۔ "ٹوپی اتار دو تم پر چوری کا کیس ثابت ہو چکا ہے۔"

"نہیں میں ٹوپی نہیں اتاروں گا۔ اس نے گھبراتے ہوئے کہا۔"

"نہیں اتارو گے تو ہم تمہیں پولیس کے حوالے کر دیں گے۔"

"وہ بے چارہ پہلے ہی پریشان تھا پولیس کا نام سن کر رونے لگا۔ اور پھر اس نے اپنے سر سے ٹوپی اتار دی۔

"ارے! یہ کیا؟ یہ تو گنجا ہے۔" سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اور وہ کمرے سے بھاگتا ہوا باہر چلا گیا۔ ہم نے بھی سب کا ساتھ دیا اور چھوٹے منے کے پاس بیٹھ گئے۔ اتفاق سے ہماری نظر اس کی آستین پر پڑی۔ جس پر کھیر کے گہرے دھبے پڑے ہوئے تھے۔

"تو تم چور ہو، یعنی آستین کا چور۔ دوسروں کی چیزیں چوری کرتے ہو۔ بے چارے گنجے کو فضول میں رلایا۔"

منے میاں جیسے پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔

"میری توبہ جو میں آئندہ چوری کروں۔ اللہ مجھے معاف کرے۔" انہوں نے کان پکڑتے ہوئے فوراً "توبہ کرلی۔ اب ہم کیا کر سکتے تھے؟

"مگر آئس کریم اور کھیر تمہیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔" ہم نے منہ بناتے ہوئے کہا اور سب ہنسنے لگے۔

●●

بکری کے بچّے

بالاچ بلوچ، پسنی

بکری کے بچّے سارے ہیں اچھے
کوئی ہے کالا کوئی ہے بُھورا
کوئی ہے چھوٹا کوئی ہے موٹا
اُچھلیں یہاں پر اُچھلیں وہاں پر
پل میں ہیں اندر پل میں ہیں باہر
ہر دم شرارت ان کی ہے عادت
پھر بھی ہیں پیارے
بکری کے بچّے

سلام کیجئے
دلوں کو جیت لیجئے

مرسلہ: خلیل حسین صدیقی

ایک شخص نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ مسلمان کے لئے کون سے اعمال بہتر ہیں۔ اس کے جواب میں آپؐ نے جو اعمال شمار کرائے۔ ان میں یہ بھی تھا کہ "لوگوں کو سلام کرنا، چاہے تم انہیں پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ کبھی کبھی وہ گھر سے باہر صرف اس غرض سے نکلا کرتے تھے کہ جو مسلمان ملے گا اسے سلام کریں گے اور اس طرح ان کی نیکیوں میں اضافہ ہوگا (موطا امام مالک)

"بیٹے! جب اپنے گھر میں داخل ہو تو ان کو سلام کرو، یہ عمل تمہارے اور تمہارے گھر والوں دونوں کے لئے باعث برکت ہوگا۔" (ترمذی)

کوپن برائے خریداری آنکھ مچولی (۱۲ شمارے)

(۱۲ شماروں کی رعایتی قیمت اندرونی سرورق پر دیکھئے)

نام: _____ ولدیت: _____

کلاس: _____ تعلیمی ادارہ: _____

پتہ: _____

برائے مہربانی مجھے _____ تاریخ سے آنکھ مچولی جاری کر دیا جائے

فون نمبر: _____ دستخط: _____

کوپن برائے "کیپشن لگائیے انعام پائیے"

نام: _____ ولدیت: _____

کلاس: _____ تعلیمی ادارہ: _____

پتہ: _____

کیپشن: (_____)

کوپن برائے قصہ کوئز

نام: _____ ولدیت: _____

کلاس: _____ تعلیمی ادارہ: _____

پتہ: _____

نوٹ: ہر شعبے کے لئے الگ کوپن آنا ضروری ہے۔ ایک کوپن پر ایک ہی نام آسکتا ہے۔ کوپن کی فوٹو کاپی قابل قبول نہیں۔

اقرأ

خالد بن محمود احمد

وہ دربار کائنات کا سب سے بڑا دربار تھا۔ اور تخت پر جلوہ افروز، سب بادشاہوں سے بڑا بادشاہ، یعنی اللہ تعالیٰ۔

مخاطب فرشتے تھے اور کچھ دیر کے بعد یہی سننے والے فرشتے کچھ کہہ رہے تھے۔ کہہ کیا رہے تھے، اعتراض کر رہے تھے۔ آدمؑ پر، اس زمین پر بسنے والے انسان پر۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنا نائب بنانے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا۔ فرشتوں کا اعتراض تھا کہ انسان نیابت کا مستحق نہیں یہ زمین پر فساد پھیلائے گا اور خون بہائے گا پھر انہوں نے اپنی تعریف کی (شاید یہ کہنا چاہتے ہوں کہ نیابت خلافت کے مستحق تو ہم ہیں) تب حضرت آدمؑ کو علم سے سرفراز کیا گیا۔

فرشتوں سے ارشاد ہوا تم سچے ہو تو (ان) چیزوں کے نام بتاؤ۔

فرشتے گنگ تھے۔

یہی بات انسان سے کہی گئی۔ اس نے فرفر سنادیا۔ حکم ہوا جھک جاؤ۔ فرشتے سجدے میں گر گئے۔ اسی کے آگے جس پر اعتراض کر رہے تھے یہ انسان کی پہلی برتری تھی جو اس کے مالک نے اسے عطا فرمائی تھی۔

پہلے انسان کی..... پہلی برتری کا..... پہلا ذریعہ.....

ذرا سوچیے کیا تھا؟؟

جی ہاں! علم.....

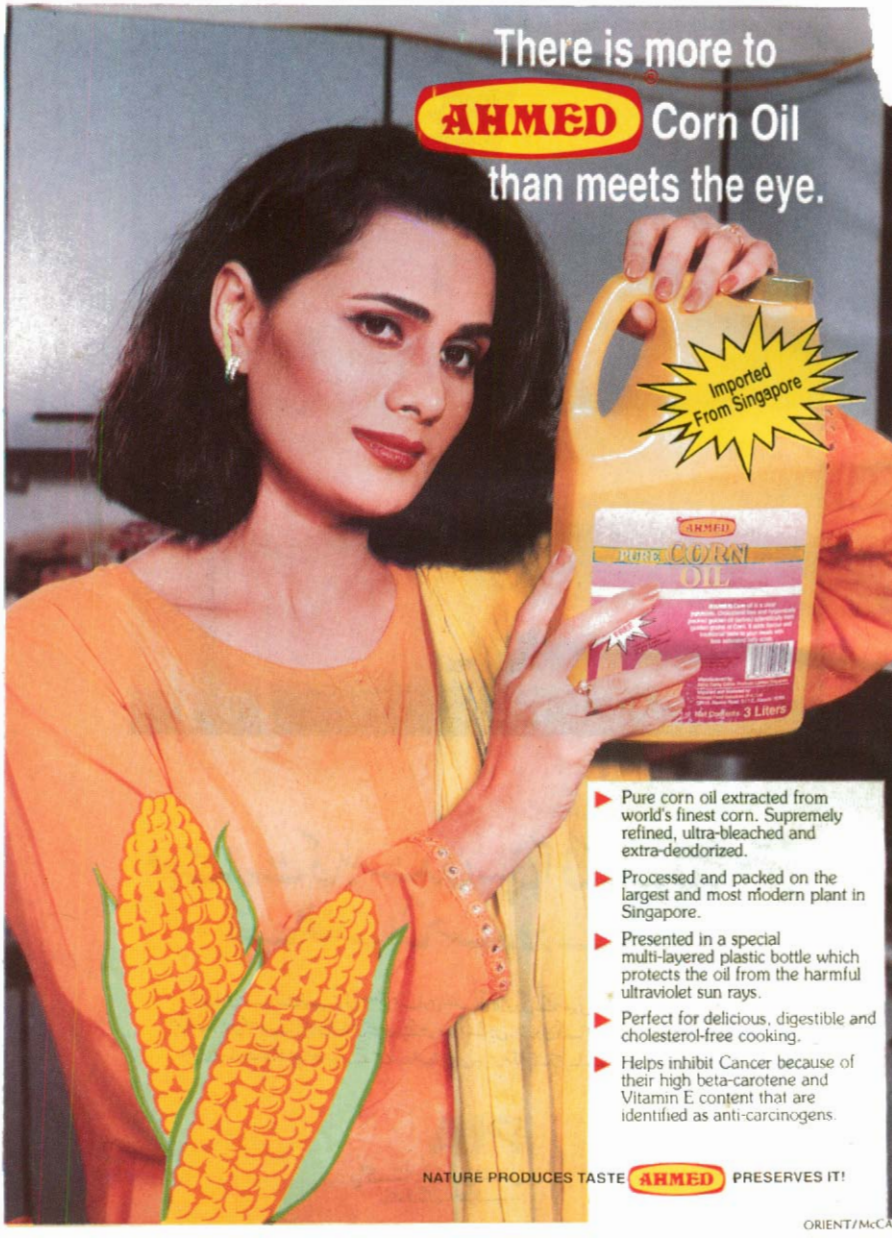
There is more to
AHMED Corn Oil
than meets the eye.
Imported From Singapore
AHMED
PURE CORN OIL
3 Liters
Pure corn oil extracted from world's finest corn. Supremely refined, ultra-bleached and extra-deodorized.
Processed and packed on the largest and most modern plant in Singapore.
Presented in a special multi-layered plastic bottle which protects the oil from the harmful ultraviolet sun rays.
Perfect for delicious, digestible and cholesterol-free cooking.
Helps inhibit Cancer because of their high beta-carotene and Vitamin E content that are identified as anti-carcinogens.
NATURE PRODUCES TASTE AHMED PRESERVES IT!

ORIENT/McCA

REGD. No. SS-246 SEPTEMBER 1996
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI

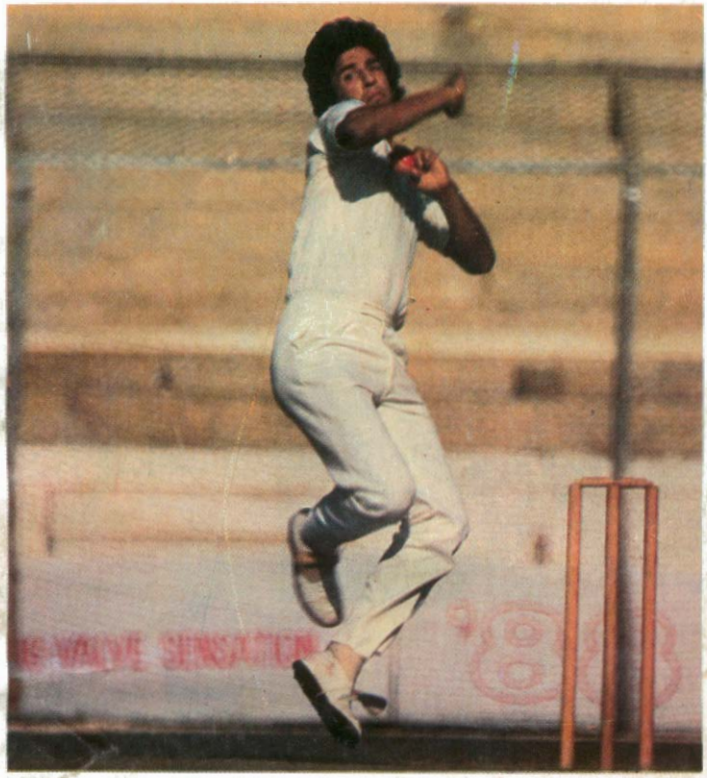

مہارت کی بلندی ۔ پی آئی اے کی جستجو
اَب فضائی حدود سے بڑھ کر

ہماری خوب سے خوب تر کی جستجو ہماری فضائی کارکردگی کے شعبوں سے لے کر کھیلوں کی دنیا تک وسیع ہے۔
ہم کھلاڑیوں کو تربیت دیکر ان کو عالمی چیمپین بننے میں مدد کرتے ہیں۔ اندرون ملک ہم ایسے ٹورنامنٹ کا انعقاد کرتے ہیں۔ جہاں
وہ اپنی مہارت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں اور دنیا بھر میں ہر اس مقام تک پہنچاتے ہیں جہاں کھیلوں کے مقابلے منعقد ہو رہے ہوں۔

PIA
پاکستان اِنٹرنیشنل
باکمال لوگ۔ لاجواب پرواز